از :

حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی

شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

از:
حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی
شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

مجلس نشریات اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱، کراچی ۷۴۶۰۰

نام کتاب ——— قرآن کا مطالعہ کیسے ؟
تصنیف ——— مولانا محمد اویس نگرامی ندوی
طباعت ——— شکیل پرنٹنگ پریس کراچی
اشاعت ——— ۱۹۹۸ء
ضخامت ——— ۶۶ صفحات

ٹیلیفون

۶۲۱۸۱۷

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

انتساب

حضرت الاستاذ علّامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

جن کی توجّہات عالیہ نے میرے اندر قرآن مجید کا

ذوق پیدا کیا

اللہ تعالیٰ استاذ مرحوم کو اپنی بے حساب رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

اویس ندوی

پیش لفظ

از :۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی (صاحب تفسیر ماجدی) رحمۃ اللہ علیہ

تلاوت قرآن مجید اگر محض بہ غرض اجر و ثواب فقط ناظرہ ہے جب بھی اس کے کچھ ادب اور قاعدے ہیں اور اگر قرآن فہمی بھی کسی درجہ میں مقصود ہو تب تو یہ آداب و قواعد ظاہر ہے کہ اہم تر ہی ہو جائیں گے اور اُن کی فہرست بھی خاصی طویل ہو جائے گی۔

سب سے مقدم شرط تو پڑھنے والے کے قلب کا ربط و تعلق قرآن مجید کے ساتھ ہے۔ تلاوت کے وقت جس درجہ قلب میں خشیت و خستگی ہو گی یا پھر شوق و نشاط ہو گا اور جس حد تک اس کے کلام الٰہی ہونے کا استحضار ہو گا اسی نسبت سے وہ اس خزانہ ہدایت سے فیض حاصل کرے گا اور اسی درجہ میں اس پر اس کتاب حکیم کے معنی و مطلب اور اسرار کھلتے رہیں گے تقویٰ و طہارت جس درجہ میں بھی اپنے سے بن پڑے ۔ فہم قرآنی کی اولین و لازمی شرط ہے۔ سر تا سر خلاف شریعت زندگی رکھنے والے اور اپنے کو دانستہ فسق و فجور میں غرق رکھنے والے پر قرآن قیامت تک نہیں کھل سکتا۔ اس سے نیچے مرتبہ میں کچھ اور بھی شرطیں مثلاً عربیت سے واقفیت عام دینی تعلیم و تربیت ۔ تاریخی پس منظر یعنی نزول قرآن کے وقت منکرین و مومنین دونوں کے طرز زندگی عادات و حالات سے متعلق معلومات دوسری ملتوں کے عقائد و اعمال پر نظر وغیرہ۔

ضرورت تھی کہ اس کتاب الٰہی سے مستفید ہونے والوں کیلئے کوئی ہدایت نامہ کسی صاحب فن کے قلم سے موجود ہوتا۔ دلی مسرت اس امر کے اظہار میں ہے کہ اس ضرورت کو ایک ندوی فاضل اور اہل قلم نے پورا کر دیا۔ وہ یہی نہیں کہ دارالعلوم ندوہ میں فن تفسیر کے استاد اور سالہا سال کا تجربہ درس قرآن کا رکھتے ہیں بلکہ اپنے ذوق وجدان کے لحاظ سے صحیح معنی میں قرآنیات کے عالم و متعلم ہیں۔ ان کا مطالعہ اس باب میں بڑا وسیع اور ان کی نظر اس خصوص میں ماشاء اللہ گہری ہے "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ"

ابن قیمؒ کی تفسیر انہیں نے بہت سی کتابوں کو کھنگال کر اور بڑی دیدہ ریزی سے التقاط کر کے مرتب و شائع کی ہے اور حیثیتوں سے بھی اپنے کو خدمت قرآن کیلئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ کتاب گو مختصر ہے پھر بھی اپنے موضوع پر کافی ہے اور اُن کی فہرست خدمات قرآنی میں ایک معقول و معتد بہ اضافہ ہے۔

عبدالماجد دریاآبادی

بارہ بنکی

۱۴ / ستمبر ۱۹۶۵ء

حرفِ آغاز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ اس کا پہلا اور حقیقی شرف ہے۔ دوسرا شرف یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے جلیل القدر نبی کے سپرد اس کی تعلیم تشریح اور تذکیر کا کام ہوا، ان نسبتوں کی عظمت اور بلندی کا تقاضا یہ تھا کہ قرآن مجید ہماری توجہات کا مرکز بن جاتا اور زندگی کے نشیب و فراز میں اسی کی رہنمائیاں ہمارے لئے مشعلِ راہ بنتیں

مگر ___________

افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا حصّہ اس مقدس صحیفہ کے مضامین و مطالب سے ناآشنا ہے اور صدمہ پر صدمہ یہ ہے کہ اس دوری و مہجوری پر اُن کو کچھ افسوس بھی نہیں ہے۔ اُن کو بھول کر یہ بھی خیال نہیں آتا ہے کہ اُن کی میزوں پر الماریوں میں اور گھروں کے طاقچوں پر قرآن مجید کے جو نسخے رکھے ہوئے ہیں وہ اپنے اندر کوئی پیغام بھی رکھتے ہیں، زندگی کے مسائل کا، اُن کے پاس کوئی حل ہے اور وہ ایک خاص دعوت کے داعی اور منادی ہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنے ذہنوں میں اسلام کا خود ایک تصور رکھتا ہے، اُس کے پاس کچھ خود ساختہ خاکے اور اپنے بنائے ہوئے نقشے ہیں۔ یہ گروہ قرآن کی آیات کو اپنے انہیں تصورات کی روشنی میں دیکھنا چاہتا ہے اور اسلام کے نظام حیات کو انہیں خاکوں اور نقشوں کے مطابق مرتب کرنا چاہتا ہے! مختصر یہ کہ یہ لوگ اپنی فکر کو قرآن کا پابند نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ قرآن کو اپنی فکر کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔

یہ دونوں طبقے بڑے ہی حرماں نصیب ہیں۔ ان کو غور کرنا چاہیئے کہ قرآن مجید جس سے ہم نے اپنی سیہ بختی کی وجہ سے منہ موڑ رکھا ہے یا جس کو ہم نے غلط طریقوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے درحقیقت یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جس کے استعمال سے قزاق و رہزن، جبرئیل امین کے اسرار کے امین و ہمراز بن گئے تھے۔ یہی وہ گنج گرانمایہ ہے، جس کو پاکر بادیہ نشینوں کی نگاہوں میں لعل و گوہر خزف ریزوں سے زیادہ قیمت نہ رکھتے تھے۔ یہی علم و حکمت کا وہ بیش بہا خزانہ ہے کہ بڑے بڑے عقلاء روزگار کو اسی کی رہنمائی کے سہارے اپنی زندگی کی منزلوں کو طے کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا اور اُس کے حکیمانہ نظریات کے مقابلہ میں اپنی محدود عقل و خرد کی شکست کے اعتراف ہی میں ان کو لذت محسوس ہوئی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے رُخ کو اسی قبلۂ مقصود کی طرف موڑا جائے۔ اس آہوئے رم خوردہ کو پھر سوئے حرم لے جایا جائے اور اس مقدس آسمانی صحیفہ کی وساطت سے اپنے بخت خفتہ کو پھر بیدار کیا جائے۔

آئندہ سطروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا اصل مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید سے استفادہ کی طرف متوجہ کیا جائے اور اُن کو اس راہ کی مشکلات سے بھی آگاہ کیا جائے اور وہ طریقہ بتلایا جائے جس سے درِ مقصود ہاتھ آئے اور منزل مطلوب تک رسائی ہو۔

ہماری معروضات کو پڑھ کر شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے قرآن مجید سے استفادہ کو قیود

شرائط کے ذریعہ بہت ہی محدود کر دیا ہے لیکن اللہ بہتر جانتا ہے کہ مقصود محض اظہار حق اور خیر خواہی ہے۔ ہمارے سامنے مسلمانوں کی ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ تاریخ کے یہ اوراق ہم کو بتلاتے ہیں کہ قرآنی آیات کو نا فہم لوگوں نے کس طرح اپنے مقاصد اور مطالب کے سلسلہ میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے خود کو قرآن سے اپنی فکر اور اپنے تصورات کے قریب کرنا چاہا۔

پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سلسلہ میں جن لوگوں سے ارادی یا غیر ارادی طور پر غلطیاں ہوئی ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے فہم قرآن کے اصول و شرائط کی رعایت نہیں کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُن میں سے ہر شخص اپنی رائے کو قرآن سے مدلل سمجھنے لگا اور اس پر مطمئن ہو گیا، جس کا دل چاہے رازی کی حجج القرآن نیز کلامی لٹریچر کو پڑھ کر ہماری رائے کی تصدیق کر سکتا ہے۔

اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اہل ذوق کو صحیح راستہ کی نشان دہی کر دی جائے جس کے اختیار کرنے کے بعد انشاء اللہ کلام الٰہی کے اسرار کے کھلنے کی توقع اور مقصود حقیقی کے حصول کی امید ہے۔

وَاللّٰہُ وَلِیُّ التَّوفِیْق

محمد اُویس ندوی نگرامی

دار العلوم ندوۃ العلماء

لکھنؤ

یکم ستمبر ۱۹۶۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

قرآن مجید کے سچے طالبعلم اور اس سے حقیقی استفادہ کرنے والے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا دل قرآن مجید کی عظمت سے معمور ہو اور یہ نور یقین اس کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہو کہ :-

ایں صفت است از صفات ازلیہ بانیہ کہ آثرا بعالم امکان ہیچ گونہ مناسبتے نہ بود حضرت حق جل وعلا، محض بعنایت خود درکسوت زبان عربی ہماں وصفت ازلی وکمال ذاتی خود را انزال فرمودہ ہموں را واسطہ فیما بینہ وبین العباد گردانیدہ۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفات ازلیہ میں سے ایک صفت ہے۔ اس صفت کو اس عالم امکان سے کوئی مناسبت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی مہربانی سے اپنے اس کمال ذاتی اور وصف ازلی کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر نازل فرمایا اور اس کو اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنایا۔

(صراط مستقیم :- از مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ)

عقیدہ کے اعتبار سے ہر مسلمان قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتا ہی ہے لیکن اس سے نفع اٹھانے کیلئے اس عقیدہ کا استحضار ضروری ہے۔

قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ قرآن کو ہم نے اتارا ہے! قرآن اللہ کی طرف

سے ہے۔ خوب ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح قرآن مجید کو اپنی طرف منسوب فرمانا اور اس نسبت کو بار بار ظاہر فرمانا محض سلسلہ سند کے بیان کیلئے نہیں ہے بلکہ اس سے قرآن مجید کی عظمت اور بلندی کا اظہار بھی مقصود ہے اس لئے کہ متکلم کی عظمت اور اس کا مرتبہ کلام کی عظمت کا باعث ہوا کرتا ہے ؎

ہزار جان گرامی فدا بہ ایں نسبت
کہ میری ذات سے اپنا پتہ دیا تو نے

اس نسبت خداوندی کی وجہ سے قرآن کی عظمت اور اس کے مضامین پر یقین کا پیدا ہونا ہی دراصل شمع ایمان کی روشنی کا باعث ہے۔

ظلوم وجہول انسان قرآن مجید کی اس نسبت کی عظمت اور جلالت کو نہ محسوس کرے تو یہ اس کی کم مایگی اور کوتاہ نظری ہے ورنہ حال تو یہ ہے کہ :۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى	اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر، تو تو دیکھ
جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا	لیتا کہ وہ دب جاتا، پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے۔
مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ	(سورۂ حشر ۱۲)

یعنی صاحب قرآن کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارا جاتا تو متکلم کی ہیبت وجلال کے سامنے وہ دب جاتا اور خوف کی وجہ سے پھٹ کر پارہ پارہ ہو جاتا جو بخت کے ارجمند اور طالع کے فیروز مند قرآن کی اس نسبت کی یقین داذعان سے بہرہ مند ہیں ان کا معاملہ یہ ہے کہ :۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى	اور جب سنتے ہیں اس کی جو اترا رسول پر تو تو
الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ	دیکھے اُن کی آنکھوں کو کہ اُبلتی ہیں آنسوؤں سے

مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ۔ (سورۂ مائدہ ۱۱) اس لئے کہ انہوں نے پہچان لیا حق بات کو)۔

یہ سعادتمند نفوس جب اللہ کا کلام سنتے ہیں تو اُن کے دل کانپ اٹھتے ہیں، اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، خوف اور رُعب کی کیفیت طاری ہو کر ان کے قلب وقالب اور ظاہر و باطن کو اللہ کی یاد کے سامنے جھکا دیتی ہے ارشاد فرمایا:۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (سورۂ زمر ۳)

اللہ نے اتاری بہتر بات آپس میں ملتی دُھراتی ہوئی بال کھڑے ہو جاتے ہیں اس سے کھال پر ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کی یاد پر

ان پاک نفسوں کا یہ حال ہے کہ اللہ کا کلام اُن کے ایمان کو مزید ترقی فرماتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (سورۂ انفال-۱)

ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام اللہ کا آیا تو ڈر جائیں ان کے دل اور جب پڑھا جائے ان پر اس کا کلام تو زیادہ ہو جاتا ہے ان کا ایمان۔

اور اسی نسخہ شفا میں اُن کو اپنے قلبی اور روحانی امراض کے علاج کا سامان مل جاتا ہے:۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (بنی اسرائیل ۹)

اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دور ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید سے نفع اٹھانے کیلئے ضروری یہ ہے کہ قرآن کی عظمت اوراس کی صداقت کا یقین لہو کے مانند رگوں میں دوڑتا ہوا ورتلاوت وتدبر کی یہ کیفیت ہوکہ قرآن مجید ہی اس کا مونس وہمدم بن گیا ہو۔امام شاطبی (المتوفی ۷۹۰ھ) نے موافقات میں صحیح فرمایا۔

"جو شخص دین کو جاننا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن ہی کو اپنا مونس وہمدم بنائے۔شب وروز قرآن ہی سے تعلق ہو، یہ ربط وتعلق علمی اور عملی دونوں طریقوں سے ہونا چاہیئے۔ایک ہی پر اکتفا نہ کرے جو شخص یہ کرے گا امید ہے کہ وہ مقصود کو پالے گا۔ (الموافقات ج ۳ ص ۳۴۶)

(۲)

جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی صفت کلام کو زبان عربی کا لباس پہنا کر اور اس کو قرآن مجید کا نام دے کر اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنایا اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو قرآن کی تشریح وتفصیل اوراسکی عملی تفسیر کیلئے مطلع انوار بنایا اس لئے قرآن مجید سے نفع اٹھانے کیلئے ضروری ہے کہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس وجود گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اعتماد، اتباع اور انقیاد کا تعلق ہو اس واسطہ کے بغیر قرآن مجید سے استفادہ کی امید کرنا ایک فعل عبث ہے۔

خود قرآن مجید نے اپنا اور پیغمبر کا جو رشتہ اور تعلق ظاہر کیا ہے وہ اس بات کے لئے واضح دلیل ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ کرنے والوں کے لئے دامنِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہ وسلم سے وابستگی ضروری ہے۔ارشاد فرمایا:۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ — وہ (رسول) اُن کو اللہ کی آیتیں سناتا او

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ سنواتا اوران کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔

(سورۂ جمعہ۔ ۱)

معلوم ہوا کہ اللہ کی کتاب کی تعلیم پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نبوت کے فرائض میں داخل تھی۔دوسرے موقع پر ارشاد ہوا:۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (سورہ نحل ۶)

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) آتاری تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اس کو کھول کر بتائے۔شاید وہ سوچیں۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کے شرح وبیان کی ذمہ داری خدا کی طرف سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سپرد کی گئی ہے،اب اس نور نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے الگ ہوکر قرآن مجید پر غور کرنا اور اس کے مضامین سے نفع اٹھانے کی توقع رکھنا بحر ظلمات میں قدم رکھنا ہے۔

اسی لئے جب مطرف بن شخیر سے ایک شخص نے کہا کہ آپ ہمارے سامنے قرآن کے سوا کچھ بیان کیجئے تو انہوں نے فرمایا:۔

واللہ ما نرید بالقرآن بدلا ولکن نرید من ھو اعلم بالقرآن۔

(الموافقات ج ۴۔ صـ۲۴)

اللہ کی قسم قرآن کے بجائے ہم بھی کوئی اور کتاب نہیں چاہتے لیکن ہم کو قرآن کے ساتھ اس کی تلاش بھی ضروری ہے جو قرآن کا سب سے زیادہ سمجھنے والا تھا۔ (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)

امام شاطبی فرماتے ہیں کہ

سنت کتاب اللہ کیلئے بمنزلہ شرح وتفسیر کے ہے۔

الموافقات ج ۴ صـ۱۰

یہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وہ انعام خداوندی ہے جس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے مخصوص احسانات کے ضمن میں شمار فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ	یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ اُن میں
بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ	انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اس کی
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ	آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ. (آل عمران ۱۷)	اور اُن کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔

ابوحیان اندلسی اپنی تفسیر البحر المحیط (ج ۱۔ ص ۔ ۳۹۲) میں حکمت کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال مجاهد الحكمة فهم القران	مجاہد کا قول ہے حکمت یعنی قرآن کا فہم۔

امام طبری فرماتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں"

امام شافعیؒ کتاب الرسالہ میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے"

قرآن مجید سے نفع اٹھانے میں اس حکمت یعنی سنت کو اس قدر دخل ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنا فیصلہ سنا دیا:۔

ولا یقدر علیہ الا من زاول ما یعینہ علیٰ ذٰلک من السنۃ المبینۃ للکتاب (الموافقات ج۔۳)	سنت جو کہ قرآن کی مفسر اور شارح ہے اس سے شغف رکھنے والا ہی قرآن مجید کو سمجھ سکتا ہے۔

اور قاضی ابن العربی مالکی نے تو یہاں تک فرمایا کہ :۔

"قرآن مجید کا ہر وہ لفظ جس سے کوئی حکم نکلتا ہو وہ لفظ مجمل ہو تو اس کی تشریح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر موقوف ہو گی، اس کی تفصیل کو شریعت میں تلاش کیا جائے وہ ضرور ملے گی۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ اسکی تشریح نہیں ملتی ہے تو اس حکم کی ذمہ داری باقی نہیں رہے گی" (احکام القرآن ج ۱ ص ۵)

ائمہ دین کی ان تصریحات سے صاف واضح ہے کہ فہم قرآن کیلئے سنت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ربط و تعلق کس قدر ضروری ہے۔

(۳)

قرآن مجید سے مکمل اور صحیح استفادہ کیلئے ضروری ہے کہ ہم کو اس سے نفع حاصل کرنے کی فکر ہو اور اس کے برکات سے مستفید ہونے کی طلب بھی دل میں موجزن ہو۔ اسی لئے ارشاد فرمایا :۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (بقرہ ۔ ۱)	راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو۔

جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا ارشاد ہے کہ یہاں تقویٰ سے مراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں ہیں بلکہ لغوی معنی مقصود ہیں۔ یعنی خوف و کھٹک، اس اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ

جن لوگوں کے قلب میں کھٹک ہے اور فکر و قصد ہے اپنی اصلاح کی قرآن اُن کو ہدایت

کرتا ہے۔"

مولٰنا نانوتویؒ نے اس موقع پر بہت ہی لطیف استدلال فرمایا ہے ان کا ارشاد ہے:۔

" سورۂ واللیل میں ارشاد ہے، فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی۔ یہاں صنعت تقابل کا استعمال کیا گیا ہے چنانچہ پہلی آیت میں اعطاء کا ذکر ہے تو دوسری آیت میں اس کے مقابل میں "بخل" کا استعمال ہے۔ اسی طرح پہلی آیت میں "کذّب" ہے تو دوسری مرتبہ "صدق" اسی طرح "استغنٰی" اور "اتقٰی" کا تقابل ہے۔ اس تقابل کی وجہ سے تقویٰ کے وہ معنی ہوں گے جو استغنٰی کے مقابل ہوں۔ استغناء کے معنی بے فکری کے ہیں تو تقویٰ کے معنی ہوں گے، فکر اور کھٹک، (ملفوظات حضرت تھانویؒ ج ۷، ص۲۷)

بے شبہ واقعہ یہی ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ کرنے کیلئے طلب صادق کی ضرورت ہے، اس کے بغیر یہ راہ کھلتی نہیں ہے۔ طلب صادق کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں قرآن مجید سے استفادہ کرنے میں معاون ہوں ان کو اختیار کیا جائے اور جو چیزیں مضر ہوں ان سے احتراز کیا جائے۔

حافظ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں ابو المعانی کی بُرہان کے حوالہ سے اس موقع کیلئے بڑے کام کی بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

" اگر کسی کے دل میں بدعت، تکبر، خواہش نفسانی اور دنیا کی محبت موجود ہے یا وہ گناہ کا عادی ہے، یا ایمان کمزور ہے، تحقیق کا مادہ کم ہے غیر مستند لوگوں کی تفسیر قبول کر لیتا ہے تو نہ وہ قرآن سمجھ سکتا ہے اور نہ اس پر اُس کے اسرار کھل سکتے ہیں۔"

اس کے بعد صاحب بُرھان، کے اس قول پر حافظ سیوطی نے حسب ذیل آیت سے

استدلال کیا۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰاتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ۔

میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق۔ (اعراف)

پھر اس آیت کی تفسیر میں سُفیان بن عُیینہ سے یہ نقل فرمایا کہ:۔

"ایسے لوگوں سے فہم قرآن چھین لیا جاتا ہے" (اتقان۔ ج ۲ ص ۱۸۱۔ مصر)

آیت ذیل بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ۔ (ق۔ ۳)

اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہے یا لگائے کان دل لگا کر۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"کسی چیز کی تاثیر کیلئے ضروری ہے کہ (۱) کوئی مؤثر ہو (۲) جس پر اثر ڈالنا مقصود ہو۔ وہ ہو (۳) اثر ہونے کے شرائط موجود ہوں (۴) جو چیزیں اثر کو زائل کرنے والی ہوں وہ نہ ہوں۔ اس آیت میں (قرآن مجید سے استفادہ کے سلسلہ میں) ان سب چیزوں کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قول "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی" میں مؤثر کی طرف اشارہ ہے۔ "لِمَنْ کَانَ قَلْبٌ" سے قلب بیدار مراد ہے (اس لئے کہ نصیحت قبول کرنے کی جگہ دل ہی ہے۔)

قرآن نے ارشاد فرمایا۔

اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ لِّیُنْذِرَ مَنْ کَانَ

یہ تو خالص نصیحت ہے اور قرآن ہے صاف تاکہ ڈر سنائے اس کو جس میں

حَيًّا - (یٰسین ۵) جان ہو۔

اَلْقَی السَّمْعَ کا مطلب یہ ہے کہ جو کہا جائے اس کو دل لگا کر سُنے۔ کسی بات سے متاثر ہونے کی یہی شرط ہے۔ وَھُوَ شَہِیْدٌ۔ کا مطلب یہ ہے کہ دل حاضر ہو غفلت اور بے فکری اثر نہیں ہونے دیتی ہے۔"

پس جب مؤثر یعنی قرآن مجید اور محل قابل یعنی قلب بیدار اور اثر ہونے کی شرط یعنی توجہ کامل موجود ہو اور اثر کو زائل کرنے والی چیز یعنی غفلت اور بے فکری نہ ہو تو (انشاء اللہ) مقصود یعنی قرآن سے نفع حاصل ہو جائے گا۔ (تفسیر القیم ص۴۴۲)

(۴)

قرآن مجید کے طالبعلم کا ذہن۔ اس معاملہ میں بھی صاف ہونا چاہئے کہ ہم کو قرآن مجید سے کن امور میں رہنمائی کی ضرورت ہے؟ قرآن مجید کا موضوع اور اس کا عنوان کیا ہے؟ اس عقدہ کا حل نہ ہونے کی وجہ سے اس راہ کے کتنے مسافر منزل مقصود سے محروم رہے۔ وہ سراب کو اپنی تشنہ لبی کا سامان سمجھے اور نتیجہ میں حیرانی و پریشانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن مجید کی اصل دعوت انسان کو سعادت ابدی کی طرف بُلانا ہے۔ وہ انسان کے ظاہر و باطن کی ایسی تعمیر کرنا چاہتا ہے کہ حیات اخروی میں اس کو کوئی زحمت نہ پیش آئے، وہ انسان کا ایسا تزکیہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ بارگاہ الٰہی میں حضوری کے لائق بن سکے۔

بے شبہ قرآن مجید نے دنیاوی زندگی کے تمام اصول و قواعد مرتب فرمائے ہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قوانین، عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، حقوق اور آداب

اس نے سب سے بحث فرمائی ہے، مگران تمام اُمور میں بنیادی نقطۂ نظر اُخروی سعادت ہے
یہی وجہ ہے کہ ان مباحث کا جن آیات میں ذکر آتا ہے ان کے اول یا آخر میں یا درمیان میں
ترغیب یا ترہیب کی آیتیں، جنت و دوزخ اور عذاب کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ
کے اسمائے حسنیٰ میں سے موقع کے اعتبار سے کسی مناسب اسم وصفت کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے
تاکہ پڑھنے والا یہ بات سمجھتا رہے کہ ان قوانین کے پیروی کے نتیجہ میں ابدی راحت اور
نافرمانی کی صورت میں اُخروی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امام شاطبی نے الموافقات (ج۔
۳) میں بڑے کام کی بات کہی کہ

"قرآن مجید کے اصل علوم تین ہی ہیں (۱) ذاتِ حق کی معرفت (۲) حق تعالیٰ
کی رضا کی صورتیں (۳) انسان کا انجام۔ پہلے علم یعنی ذات حق کی معرفت
میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور افعال کا علم داخل ہے اور اسی سلسلہ
میں نبوت سے بھی بحث ہے اسلئے کہ عبد اور معبود کے درمیان یہی واسطہ
ہے، دوسرے علم میں عبادات اور معاملات وغیرہ داخل ہیں۔

تیسرے علم میں موت اور اس کے احوال، قیامت اور اس کے مشتملات
اور جنت و دوزخ کے احوال داخل ہیں، اسی قسم میں ترغیب اور ترھیب کی
آیات اور وہ آیتیں جن میں نیکو کاروں کی نجات اور بدکاروں کے برے انجام
کے واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بھی شامل ہیں"

مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید کا اصل موضوع، انسان کی وہ رہنمائی ہے جس سے دنیا
میں وہ ایسی زندگی گزارے جو آخرت میں اس کے لئے نفع بخش ہو اور رضائے الٰہی اس کے
نصیب میں آئے۔

قرآن مجید نے اپنے کو دنیا میں اسی پیغام کے ساتھ پیش کیا ہے اور اپنی دعوت کے اسی عنوان کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ (بقرہ)

یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں یہ پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ۔ (اسراء)

یہ قرآن اس تعلیم کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ صحیح اور سیدھی ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔

اور قرآن سے ہم وہ اتارتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفاء اور رحمت ہے۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ (فصّلت)

کہہ دیجئے کہ یہ کتاب مومنوں کے لئے ہدایت وشفاء ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (یونس)

لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نصیحت آچکی اور وہ دلوں کے امراض کے لئے علاج ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کے احکام، تعلیمات، ارشادات اور اس کی ہدایات ہی اس کے وہ اوصاف خصوصی ہیں جو اس کی دعوت کا اصل موضوع ہیں، اسی لئے اہل علم کی ایک جماعت مثلاً شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسی کو قرآن کا اصلی اعجاز قرار دیا ہے۔ پس قرآن مجید کی آیات پر غور کرنا چاہیئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے الفوز الکبیر میں صراحت کے ساتھ فرمایا ہے!

محقق آنست کہ قصد اصلی از نزول قرآن تہذیب بشر است و درہم شکستن عقاید باطلہ و اعمال ایشاں۔	قرآن مجید کے نزول کا اصلی مقصد انسانوں کی تہذیب و تربیت اور اُن کے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی اصلاح ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اسی مفہوم کو تفہیمات میں اس طرح ادا کیا۔

"اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تفسیر کا علم مختصر الفاظ میں عنایت فرما دیا، جس کی حقیقت یہ ہے کہ ایمان حقیقی ہر انسان کے قلب کے اندر ودیعت ہے لیکن مادی زندگی کی سرمستیوں نے انسان پر قبضہ پالیا پس اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرمایا تاکہ اس کے ذریعہ سے ان کی طبیعتوں کو مغلوب فرمائے"

(ج - ۲ - ص ۱۲۲ و ۱۲۳)

مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا اصل موضوع یہی ہے کہ عبد اور معبود کے رشتے کو صحیح اصولوں پر استوار کیا جائے اور دنیاوی زندگی کو اُخروی زندگی کی بنیاد بنایا جائے۔

اب کس قدر ستم ہے کہ لوگ قرآن مجید میں قدیم و جدید فلسفہ کے مباحث ہیئت کے مسائل، سائنس کے کرشموں اور تاریخ و جغرافیہ کے نکات کی تلاش و جستجو کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے قرآن کی صداقت اور اسی معیار سے اس کی عظمت کو جانچنا چاہتے ہیں! ہم کو اس سلسلہ کے ضمنی فوائد سے انکار نہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں قرآن کا موضوع نہیں ہیں اور اس کا مقام تو اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ بے شبہ قرآن مجید نے کائنات اور اس کے حوادث سے تعرض کیا ہے مگر اسکی نوعیت کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:-

"قرآن مجید علوم طبیعہ کا بھی ذکر فرماتا ہے لیکن فلسفی اور صاحب قرآن

کے نقطہ میں فرق ہے مثلاً ایک طبیب جانوروں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کے
خواص پر غور کرتا ہے اور صاحب دولت جب جانوروں کو دیکھتا ہے تو وہ
سوچتا ہے کہ ان میں سے سواری کے لائق کون ہے اور بار برداری کے قابل
کون ہے؟ اسی طرح صاحب قرآن بھی کائنات سے تعرض کرتا ہے مگر اس
کا مقصود اللہ کی قدرت اور اس کے علم وحکمت کا اظہار ہوتا ہے اس کے
سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا ہے۔ (سطعات ص۱۱-۱۲)

یہ تو دنیاوی علوم کا مسئلہ ہے۔ شاہ صاحب کو تو اس باب میں ان لوگوں سے بھی
شکوہ ہے جو خالص دینی علوم میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ مقصود ان سے گم ہو جاتا ہے،
قصص قرآن کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

"قرآن مجید نے جن قصص کو بیان فرمایا ہے، ان کے صرف ضروری حصوں
کا ذکر کیا ہے ان کے تمام اجزا کے ذکر سے احتراز کیا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے
کہ اگر پورا واقعہ بیان کیا جائے تو وہ لوگ ان واقعات میں پڑ جاتے ہیں اور
عبرت پذیری جو مقصود اصلی ہے اس سے غافل ہو جاتے ہیں اس لئے
قرآن نے ان ضروری حصوں کو لیا۔ باقی کو چھوڑ دیا۔ ایک عارف نے کہا ہے کہ
جب سے لوگ تجوید وقواعد میں (غلو کے ساتھ) لگے تلاوت قرآن میں خشوع
باقی نہ رہا اور جب سے اہل تفسیر نے تفسیروں میں دور از کار بحثوں کو چھیڑا فن
ختم ہو گیا" (الفوز الکبیر)

قرآن مجید کے طالبعلم کو اس سلسلہ میں بہت محتاط رہنا چاہیئے اور اسکی نظر قرآن
کے اصل موضوع پر رہنا چاہیئے تاکہ گوہر مقصود ہاتھ آجائے۔

(۵)

قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح کیلئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن اس کے بعد سنت اور پھر اقوال صحابہؓ و تابعین کی طرف رجوع کیا جائے۔

قرآن عربی زبان میں ہے اس لئے بے شبہ قرآن کے الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں لغت عرب سے چارہ نہیں اس لسانی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ امر قابل لحاظ ہے کہ قرآن کی کچھ خود اپنی اصطلاحات ہیں اور اُن کو کتاب و سنّت ہی سے حل کیا جا سکتا ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ میں لفظ "صراط مستقیم" ہے، لغت میں جس کے معنی "سیدھے راستے" کے ہیں۔ مگر قرآن نے "صراط مستقیم" کے لفظ سے کونسا سیدھا راستہ مراد لیا ہے؟ اس کی تشریح بعد کو خود ہی فرما دی۔ یعنی

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ	ان کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا ہے۔

انعام کن لوگوں پر ہوا ہے؟ اس کی تشریح بھی دوسرے موقعہ پر فرما دی گئی۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ	جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول کا سو وہ
مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ	ان کے ساتھ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	کہ وہ نبی اور صدیق اور شہید اور نیک
وَالصّٰلِحِيْنَ۔	بخت ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ "صراط مستقیم" سے مراد انبیاء، صدیقین، شہید اور صالحین کا راستہ ہے۔

اسی طرح سورۂ آل عمران کے آخر میں فرمایا کہ زمین و آسمان کی پیدائش اور شب و روز کے اُلٹ پھیر میں پختہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ قرآن مجید نے اس

موقع پر پختہ عقل والوں کے لئے اولوالالباب کا لفظ استعمال کیا ہے قرآن کے نزدیک اولوالالباب کون سے لوگ مراد ہیں؟ اس کی تشریح میں ارشاد فرمایا کہ اولوالالباب وہ لوگ ہیں جو اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں عبادات کے سلسلہ میں، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ زکوٰۃ کے معنی بڑھنے کے، صوم کے معنی قصد کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے معنی یہاں مقصود نہیں ہیں بلکہ اُن میں سے ہر لفظ کا خاص مفہوم مراد ہے اور اس مفہوم کی تعیین سنّت کرتی ہے اگر اس تعیین کو نہ مانا جائے اور صرف لُغت کو سامنے رکھا جائے تو عبادات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ سکتی ہے۔ اسی لئے حافظ ابن قیمؒ نے فرمایا۔

"قرآن مجید کا ایک خاص عرف ہوتا ہے اور اُس کے کچھ متعین معنی ہوتے ہیں اور اس عرف سے ہٹ کر قرآن کی تفسیر جائز نہیں۔

(التفسیر القیم ص ۲۶۹)

اس زمانے میں قرآن مجید کے سمجھنے کے جو دردناک اور تکلیف دہ مناظر سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک روح فرسا منظر یہ بھی ہوتا ہے کہ عربی زبان کی چند ریڈریں پڑھ کر لوگ اپنے کو فہم قرآن اور اس سے استنباط و استناد کا جائز حق دار جاننے لگتے ہیں۔ یہ سخت جرأت کی بات اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ اقدام ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اپنے رسالہ "اصول تفسیر" میں تفسیری غلطیوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کی تفسیر محض لغت عرب سے کی ہے اور یہ لحاظ نہیں کیا کہ متکلم قرآن کی کیا مراد ہے اور جس پر قرآن نازل ہوا، کیا مطلب بیان

فرمایا ہے۔ ۹؟ اور وہ لوگ جو قرآن کے اولین مخاطب تھے کیا سمجھتے تھے ؟ (صفحہ ۶۷)

علامہ قرطبی (۶۷۱ھ) نے اپنی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں فرمایا۔

"جو شخص سماع اور نقل کی مدد لئے بغیر محض عربیت کی بنار پر قرآن کی تفسیر کرے گا اس سے بہت غلطیاں ہوں گی اور وہ تفسیر بالرائے کا مرتکب ہوگا"

قرآن مجید کے الفاظ کی تفسیر و توضیح و تشریح کیلئے لغت عرب کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے عرف اسکی اصطلاحات اور جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریحات کا علم ضروری ہے۔ ورنہ نتائج بے حد خطرناک ہیں۔

اس موقعہ پر مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حسب ذیل ہدایت زیادہ لائق توجہ ہے۔

"مفردات میں قرآن مجید وہ کلمہ اختیار فرماتا ہے جس سے ادنی بالحقیقہ وادنی بالمقام ثقلین نہیں لاسکتے، مثلاً جاہلیت کے اعتقاد میں موت پر توفی کا اطلاق درست نہ تھا۔ کیونکہ اُن کے اعتقاد میں نہ بقائے جسد تھی اور نہ بقائے روح، توفی، وصول کرنے کو کہتے ہیں ان کے عقیدہ میں موت توفی نہیں ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید نے توفی کا لفظ اطلاق کیا اور بتلایا کہ موت سے وصول یابی ہوتی ہے نہ فنا محض، اس حقیقت کو ایک کلمہ سے کشف کر دیا اور کہیں اس لفظ کا اطلاق اپنے اصلی معنی سے مع الروح کے وصول کرنے پر کیا۔"[۱]

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید جس موقع پر جو لفظ

---

[۱] جناب مولانا احمد علی صاحب مرحوم کے حواشی قرآن پر حضرت شاہ صاحبؒ نے جو تقریظ لکھی ہے اس میں یہ عبارت موجود ہے۔ ۱۲

استعمال فرماتا ہے وہ موقعہ اور ادائے مطلب کے لحاظ سے بیحد اہم ہوتا ہے، بسا اوقات ایک لفظ پورے ایک مسئلہ کا حامل ہوتا ہے اس لئے الفاظ قرآن کے معنی کی تعیین و تشریح میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

(۶)

قرآن مجید کی آیات کے مفہوم کی تعیین میں بھی یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیئے کہ بہترین طریق کار یہی ہے کہ آیات قرآنی کی تشریح قرآن اور اس کے بعد سنت اور اقوال صحابہ و تابعین سے کی جائے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے فرمایا۔

"تفسیر کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے۔ قرآن میں جو مضمون ایک جگہ مجمل ہے، دوسری جگہ مفصل ملے گا۔ اور جہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل ملے گی اور اگر اس میں کامیاب نہ ہوسکو تو سنت کی طرف رجوع کرو۔ جو قرآن کی شرح اور تفسیر کرتی ہے۔ بلکہ امام ابو عبداللہ محمد بن ادریس الشافعیؒ نے تو یہاں تک فرمادیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو حکم دیا ہے وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔

(اصول تفسیر صفحہ ۹۲)

قرآن مجید کی آیات متشابہ یعنی ملی جلی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتی ہیں۔ ارشاد فرمایا۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ۔

اللہ نے اُتاری بہتر بات کتاب آپس میں ملتی دُھرائی ہوئی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔

آیات قرآن متشابہ اند بعض آں مصدق است و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبین قرآن عظیم است ،
(ازالۃ الخفا مقصد اول فصل سوم)

آیات قرآنیہ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں ایک آیت دوسری آیات کی مصدق ہے اور اصلی مفسر قرآن عظیم کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اسلئے ہر آیت کا وہ مطلب مراد لینا چاہیئے جس کی تائید دوسری آیت وسنت سے ہوتی ہے ۔ اگر اس اصول کی رعایت نہ کی جائے گی ، تو قدم قدم پر لغزش کا اندیشہ ہے ، مثلاً سورہ بقرہ میں یہود کے باب میں فرمایا گیا ہے کہ یہ دنیا میں ہمیشہ ذلیل ورسوا رہیں گے ۔ ارشاد ہوا ۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔ (بقرہ)

اور ڈالی گئی ان پر ذلت اور رُسوائی اور پھرے اللہ کا غضب لے کر۔

لیکن ادھر جب سے اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی اور یہود کو ایک وطن ملا اس وقت سے برابر استفسارات ہوتے رہتے ہیں کہ قرآن نے تو یہود کے متعلق ذلت ورسوائی کی پیشگوئی فرمادی تھی اب یہود کیسے اقتدار کے مالک بن گئے ؟ حالانکہ سورۂ آل عمران میں اسکی تفصیل موجود ہے وہاں فرمایا ۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (آل عمران ۱۲)

ماردی گئی اُن پر ذلت جہاں پائے جائیں سوا دستاویز اللہ کے اور دستاویز لوگوں کے ۔

اس آیت میں واضح فرمادیا گیا کہ یہود کو ذلت ورسوائی سے بچنے کی دو ہی صورتیں ہیں وہ یا اسلام قبول کریں[1] یا دنیا میں کسی دوسرے کی سرپرستی قبول کریں ۔ مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے سہارے کے بغیر وہ قومی عزت کے مالک نہیں بن سکتے ۔ اب بنی اسرائیل کی حکومت کا قیام

---

[1] اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔ کی بعض دوسری تفسیریں بھی کی گئی ہیں ۔ ۱۲

خود یہود کا رہین منت ہے یا ساحران فرنگ کی ادنیٰ ساحری کا نتیجہ ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے۔
اس طرح سورۂ آل عمران کی اس تشریح کے بعد سورۂ بقرہ کی آیت بحث طلب باقی نہیں رہتی ہے۔ اسی طرح سورۂ مائدہ کی آیت۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَ	بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور
الصَّابِئُوْنَ وَالنَّصَارٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	فرقہ صابئی اور نصاریٰ پر جو کوئی ایمان لائے،
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا۔ (ع۱۰)	اللہ پر اور روز قیامت پر اور عمل کرے نیک۔

کے متعلق اس زمانہ میں یہ بحث پیدا ہو گئی کہ نجات کیلئے صرف اللہ پر ایمان کافی ہے، پیغمبروں پر فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ آیت مذکورہ میں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کا ذکر ہے یہ بحث نتیجہ اسی غلط روی کا ہے کہ آیت قرآنی کی تشریح میں دوسری متعلقہ آیات پر نظر نہیں کی جاتی۔

صورت تو یہ ہے کہ رسولوں پر ایمان کے انکار کو قرآن نے کفر قرار دیا ہے ارشاد ہوا:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ	جو لوگ منکر ہیں اللہ کے اور اس کے رسولوں
وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ	کے اور چاہتے ہیں کہ فرق نکالیں اللہ
وَرُسُلِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ	اور اس کے رسولوں میں اور کہتے ہیں ہم
وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ	مانتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے ہیں
یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۝	بعضوں کو اور چاہتے ہیں کہ نکالیں اس
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ	کے بیچ میں ایک راہ ایسے لوگ وہی ہیں
(نساء ــ ۲۱)	اصل کافر۔

اس صریح ارشاد کے بعد سورۂ مائدہ کی آیت سے رسالت وغیرہ پر ایمان کو غیر ضروری

کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اصل یہ ہے کہ سورۂ مائدہ کی آیت مجمل ہے مقام اجمال میں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کا ذکر کیا جاتا ہے اور مقام تفصیل میں پورے سلسلۂ ایمانیات کا اظہار فرمادیا جاتا ہے چنانچہ سورۂ تغابن میں تفصیل واجمال دونوں کی مثالیں موجود ہیں چنانچہ ایمانیات کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ	سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور
الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا	اس نور پر جس کو ہم نے اتارا ہے اور اللہ کو
تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ	تمہارے سب کام کی خبر ہے جس دن تم کو اکٹھا
لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ	کرے گا جمع ہونے کے دن۔ وہ دن ہے
(تغابن ۔ ۱)	ہار جیت کا۔

اس آیت میں اللہ اور رسول، قرآن اور قیامت، سب پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے اور اسی کے بعد جب پورے مجموعے کی طرف ارشاد کرنا منظور ہوا تو بطور اجمال فرمادیا۔

وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا۔ جو کوئی یقین لائے اللہ پر اور کام کرے بھلا۔
(تغابن ۔ ۱)

یہ تو صرف دو مثالیں ہیں جن کے ذریعہ یہ دکھلانا مقصود ہے کہ آیات قرآنی کی تشریح وتاویل میں دوسری آیات پر نظر رکھنا کس قدر ضروری ہے؟ اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ آیات قرآنی کے مفہوم کے تعین کیلئے محض عربی زبان کی واقفیت کافی نہیں ہے بلکہ مسائل قرآن پر غائر نظر ہونے کی ضرورت ہے اس لئے فہم قرآن کے ہر مدعی کا دعویٰ قبول نہیں ہوسکتا ہے، جو لوگ تراجم کی مدد سے قرآن مجید سے نفع اٹھانا چاہتے ہیں ان کی خدمت میں بھی عرض ہے کہ کسی واقف کار کی مدد سے یا کسی معتبر حاشیہ یا مستند تفسیر کے

ساتھ قرآن کا ترجمہ پڑھیں ورنہ محض ترجمہ کا مطالعہ مضرت کے اندیشہ سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ ترجمہ میں ناسخ، منسوخ، مجمل مفصل، مطلق، مقید اور نزول آیات کے پس منظر وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہوتا ہے اور ان چیزوں کے علم کے بغیر صحیح مفہوم اور مقصد تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

(۷)

قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح اور آیات کے مفہوم کی تعیین کے سلسلہ میں ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ و تابعین کا ذکر آیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ تفسیر کے روایتی حصے کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ تفسیری روایات کے متعلق عجیب افراط و تفریط کا معاملہ ہے اگر ایک طرف کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو تحقیق و تنقید کے بغیر کتب تفاسیر میں نقل کی ہوئی ہر روایت پر ایمان لانے کیلئے تیار ہیں تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو تفسیر کے پورے روایتی حصہ کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حق ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں ہے۔ صحیح راستہ درمیان کا ہے یعنی محدثین نے روایات کی تحقیق و تنقید کے جو اصول مرتب فرمائے ہیں ان پر جو روایات پوری اُتریں وہ قبول کی جائیں ورنہ رد کر دی جائیں۔

تاریخی حیثیت سے تفسیری آثار و روایات کے تین دور قائم ہو سکتے ہیں۔

(۱) پہلا دور حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے جن کو بارگاہِ نبوت سے براہ راست فہم قرآن کا موقعہ ملا۔ ہر چند کہ حضرات صحابہؓ عموماً اہل عرب تھے اور انہیں کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، مگر یہ فہم قرآن میں اپنے کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پابند اور محتاج سمجھتے تھے، کوئی لفظ یا آیت ان بزرگوں کی سمجھ میں نہ آتی تو حضور سے دریافت فرماتے

خود سرورکونین (صلے اللہ علیہ وسلم) آیات کی توضیح وتشریح فرمایا کرتے تھے، اکابر صحابہؓ اپنی علمی مجلسوں میں بھی قرآن مجید کے متعلق بہت سے نکتے حل فرماتے قرآن کے غریب الفاظ کی شرح میں دیوان عرب سے کام لیتے۔ احکام قرآن پر غور فرماتے۔ مسائل کا استنباط کرتے، شان نزول بیان فرماتے۔ اگر کسی کو غلط معنی اخذ کرتے یا بیان کرتے ہوئے دیکھتے تو اس کی اصلاح فرمادیتے۔

صحابۂ کرام میں دس حضرات کو اس فن میں خاص امتیاز حاصل تھا۔

خلفائے راشدینؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہؓ بن عباس، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابوموسیٰؓ اشعری، حضرت عبداللہؓ بن زبیر، (رضی اللہ عنہم اجمعین)

ان حضرات کے سوا حضرت انسؓ، حضرت ابوہریرۃؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمر، حضرت جابرؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص سے بھی تفسیری روایات مروی ہیں مگر بہت کم، حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص کی مرویات زیادہ تر قصص اور اخبار وفتن سے متعلق ہیں[1]۔

خلفائے راشدین میں سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہیں۔ حضرت علیؓ کے بعد حضرت عبداللہؓ بن عباس کی طرف منسوب ہیں۔ عہد صحابہ میں ایک تفسیری مجموعہ کا انتساب حضرت ابی بن کعبؓ کی طرف ہے۔ اس سے ابن جریر طبری نے بکثرت اخذ کیا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں نیز امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اس سے اخذ کیا ہے[2]۔

صحابۂ کرام کے بعد تابعین کا دور آتا ہے اس دور میں مکہ اور کوفہ تعلیم قرآن کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

---

[1] اتقان ج ۲ صفحہ ۱۲۷۔ [2] مبادی التفسیر۔ شیخ محمد خضری دمیاطی۔ ۱۲

مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ حضرت مجاہد (۱۰۲ یا ۱۰۳ھ) حضرت سعید بن جبیر (۹۴ھ) حضرت عکرمہ (۱۰۶، ۱۰۷ھ) حضرت طاؤس (۱۰۶ھ) حضرت عطا بن رباح (۱۱۴ھ) کا فیض جاری تھا اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ حضرت علقمہ بن قیس (۱۰۲ھ) حضرت اسود بن یزید (۷۵ھ) حضرت ابراہیم نخعی (۹۵ھ) اور امام شعبی (۱۰۵ھ) خدمت دین میں مصروف تھے۔

ان حضرات کے سوا اس عہد کے مشاہیر حضرت حسن بصری (۱۲۱ھ) عطا بن ابی سلم خراسانی، محمد بن کعب القرظی (۱۱۷) ابوالعالیہ رفیع بن مہران الریاحی (۹۰ھ) ضحاک بن مزاحم (۱۰۵ھ) عطیہ بن سعید العوفی (۱۱۱ھ) قتادہ بن دعامہ (۱۱۷ھ) ابومالک زید بن اسلم، ربیع بن انس، مرۃ ہمدانی (۷۶ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔

صاحب کشف الظنون نے جن کتب تفسیر کا ذکر کیا ہے ان میں سے حضرات تابعین کی طرف جن کا انتساب ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) تفسیر عکرمہ (۲) تفسیر عوفی (۳) تفسیر مجاہد (۴) تفسیر والبی (۵) تفسیر زید بن اسلم، ابن الوزیر یمنی نے ایثار الحق میں حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگرد علی بن طلحہ ہاشمی کی تفسیر نیز تفسیر امام حسن بصری، تفسیر عطا بن رباح، تفسیر محمد بن کعب القرظی کا ذکر کیا ہے۔

علی بن طلحہ کی تفسیر کے متعلق حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ اس کا ایک نسخہ امام لیث کے کاتب شیخ ابوصالح کے پاس تھا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ یہ نسخہ مصر میں ہے، اگر کوئی محض اس کیلئے مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اس صحیفہ سے ابوجعفر نحاس (۳۳۸ھ) نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں کافی اخذ کیا ہے۔ ابن جریر

نے اپنی تفسیر میں اس سے تخریج کی ہے[1]۔

حضرت سعد بن جبیر کی طرف بھی ایک تفسیر منسوب ہے جو تفسیر عطا ربن دینار کے نام سے مشہور ہے[2]۔ اس دور کی تفسیری کوششوں کے متعلق اُمور ذیل لائق توجہ ہیں۔

(۱) اس دور کی تفسیر کا بڑا سرمایہ حضرات صحابہ کرام کی روایات اور انکے اقوال ہیں خود تابعین بھی تلاش وتفحص اور اجتہاد نیز استنباط مسائل سے کام لیتے تھے، قرآن کے متعلق ان کی لغوی تشریحات کو امام بخاریؒ نے اپنے صحیح میں جمع کر دیا ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس کے تلامذہ میں مجاہد کا بڑا مرتبہ ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کا بیان ہے۔

"مجاہد کی تفسیر پر اکثر ائمہ مثلاً ثوری، امام شافعی، احمد بن حنبل اور بخاری اعتماد کرتے تھے۔ امام ثوری کا بیان ہے کہ اگر تم کو کوئی تفسیر مجاہد سے ملے تو بس کافی ہے۔

(تفسیر سورۂ اخلاص صفحہ ۹۴)

(۳) حضرت مجاہد کی عظمت اور جلالت علم کے باوجود ان کے دو اقوال کو ائمہ اہل تفسیر نے قبول نہیں کیا ہے۔ ایک مقام محمود کی تفسیر دوسرے اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کی تفسیر[3]۔

(۴) صاحب فجر الاسلام نے طبقات ابن سعد (جز ۵ ص ۳۴۴) کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ بعض اہل علم کو مجاہد کے اقوال قبول کرنے میں تامل تھا، مگر اسی مقام پر خود ہی مصنف فجر الاسلام نے کہا ہے کہ

"مجاہد کے صدق میں ہم کسی کو متردد نہیں پاتے[4]"

---

[1] مرآۃ التفسیر صفحہ ۱۱۴ [2] میزان الاعتدال ترجمہ عطا ربن دینار ۱۲ [3] تفسیر روح المعانی (سورۂ اسراء) آیت (عسیٰ ان یبعثک ربک الخ) [4] فجر الاسلام ج ۱ ص ۲۵۲

(۵) حضرت مجاہد کو حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت سے بھی بڑی مدد ملی وہ فرماتے تھے کہ حضرت ابن عباس سے استفسارات سے قبل اگر میں نے عبداللہ بن مسعود کی قرأت کو پڑھا ہوتا تو بہت سے سوالات کی ضرورت نہ پڑتی۔ (الروض الانف ج اول صفحہ ۲۲۰)

(۶) حضرت عبداللہ بن عباس کی طرف جو تفسیری روایات منسوب ہیں اُن میں سے بعض سندوں میں انقطاع پایا جاتا ہے مگر فی نفسہ وہ معتبر ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے اس سلسلے میں حسب ذیل نام لئے ہیں۔

سُدِّی کبیر، ضحاک، علی بن ابی طلحہ والبی، قتادہ۔

اور بعض سندیں ایسی ہیں جن میں ضعف پایا جاتا تھا۔ مثلاً۔

(۱) جویبر بن سعید عن الضحاک عن ابن عباسؓ اس سند میں جویبر ضعیف راوی ہیں۔

(۲) عبیداللہ بن سلیمان عن الضحاکؒ عن ابن عباسؓ اس سند میں عبیداللہ ضعیف راوی ہیں۔

(۳) محمد بن سعد العوفی عن آبائہٖ عن عطیۃ العوفی عن ابن عباس، اس سند میں عطیہ ضعیف راوی ہے۔

محمد السائب الکلبی، عن ابی صالح باذام عن ابن عباسؓ، اس سند میں باذام ضعیف اور کلبی کذاب ہے۔

ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ

کلبی کی کتاب التفسیر اس لائق ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔ ج۔ص ۱۱۶

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

کلبی، سدی صغیر اور مقاتل بن سلیمان متروک ہیں۔

یہی بات صاحب کشف الظنون نے بھی کہی ہے۔

حضرات تابعین کے بعد تبع تابعین کا دور آتا ہے ان کا اصل کارنامہ اقوال صحابہ و تابعین کا جمع کرنا اور ان کی اشاعت ہے۔ دوسری روایات کو بھی انہوں نے جمع کیا ہے لیکن جرح و تنقید سے الگ رہے۔ (اِلَّا مَاشَاءَ اللہ)

اس سلسلہ میں قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔

سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) وکیع بن الجراح (۱۹۶ھ) شعبہ بن الحجاج (۱۶۰ھ) اسحاق بن راہویہ (۲۳۸ھ)، یزید بن ہارون السلمہ (۲۰۶ھ) عبدالرزاق بن ہمام (۲۱۱ھ) آدم بن ابی ایاس (۲۲۰ھ) روح بن عبادۃ (۲۰۵ھ) سنید بن داؤد (۲۲۰ھ) ابوبکر بن ابی شیبہ (۲۳۵ھ) عبد بن حمید (۲۴۹ھ) ابن وھب (۱۹۹ھ)۔

اس دور میں تفسیری دائرے کو بہت وسعت ہوئی، بہ کثرت روایات کا سلسلہ پھیلا صاحب کشف الظنون نے جن تفسیروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ذیل کی تفسیریں اس دور کی ہیں۔

(۱) تفسیر ابن جریج (۱۵۰ھ) (۲) تفسیر مقاتل (۱۵۰ھ) (۳) تفسیر آدم بن ابی ایاس (۲۲۰ھ) (۴) تفسیر شعبہ بن الحجاج (۱۶۰ھ) (۵) تفسیر عبدالرزاق بن ھمام (۲۱۱ھ) (۶) تفسیر عبد بن حمید (۲۴۹ھ) (۷) تفسیر وکیع بن الجراح (۱۹۷ھ) (۸) تفسیر یزید بن ہارون ۱۱۷ھ (۹) روح بن عبادہ کے متعلق تہذیب میں جمع تفسیر کا ذکر ہے (۱۰) ابوبکر بن ابی شیبہ کی تفسیر کا ذکر خطیب کرتے ہیں۔ (۱۱) سید بن داؤد کو بھی صاحب تفسیر مانا جاتا ہے[1] (۱۲) تفسیر سفیان ثوری (۱۹۷ھ)[2] (۱۳) تفسیر امام مالک[3]۔

تفسیر امام مالک کے متعلق شک ہے کہ یہ خود امام صاحب کی تالیف ہے یا کسی شاگرد نے

۱؎ مرآۃ التفسیر ۲؎ کتب خانہ رامپور میں موجود ہے ۳؎ حیات امام مالک صفحہ ۶۸۔

امام صاحب سے اس کی تعلیق کی ہے ۔

ان تمام تفسیروں کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان میں سے کوئی مجموعہ بہ ترتیب مصحف تمام قرآن کی تفسیر نہ تھا بلکہ صورت یہ تھی کہ جس کے پاس جو تفسیری روایات تھیں وہی تفسیری مجموعہ کی شکل میں آگئیں ہمارے سامنے بہ ترتیب مصحف قرآنی کی پہلی اور جامع تفسیر ابن جریر کی ہے ۔ ابن جریر نے تمام تفسیری ذخیروں کو جو اُن کے عہد میں تحریری یا زبانی طور پر موجود تھے اپنی تفسیر میں جمع کر کے ان کو دست برد زمانے سے محفوظ کر دیا چنانچہ ذیل کے مآخذ اُن کی تفسیر کا اصل قرار پائے ۔

(۱) کتب تفسیر مصنفہ عن عبداللہ بن عباس (۲) کتب تفسیر عن سعید بن جبیر (۳) مجاہد (۴) قتادہ بن دعامہ (۵) حسن بصری (عکرمہ) (۷) ضحاک بن مزاحم (۸) عبداللہ بن مسعود (۹) تفسیر عبدالرحمان بن زید اسلم (۱۰) ابن جریج (۱۱) تفسیر مقاتل ، ان کتابوں کے سوا دوسری احادیث مشہورہ و مسندہ بھی حسب ضرورت ذکر کی گئی ہیں[1] ۔

تفسیر ابی بن کعب اور تفسیر علی بن طلحہ کے متعلق اوپر ذکر آچکا ہے کہ ابن جریر نے ان کو اپنی تفسیر کا مآخذ بنایا ہے

تفسیری آیات و روایات کے یہ تین اہم دور تھے ، جن کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنا چاہئے کہ تفسیری روایات میں بھی حدیث کے عام قاعدہ کے مطابق سند کی بڑی اہمیت ہے اگر سند کے اعتبار سے کسی روایت میں نقص نہیں ہے تو اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرنا چاہئے اور اگر سندی حیثیت کمزور ہے تو وہ روایت اسی مرتبہ پر رکھنے کے لائق ہے جس کے وہ قابل ہے اسی لئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے

---

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۔ ۴۴ ۴۴۴

تفسیر ابن جریر کو جو کہ تفسیری روایات کا سب سے اہم ذخیرہ ہے کتب حدیث کے طبقہ چہارم میں رکھا ہے اور اس طبقہ کی کتابوں کیلئے فرمایا۔

"اگر کسی کو ان کتابوں کی تحقیق کا شوق ہو تو اس کو چاہیئے کہ اُن کے راویوں کا حال معلوم کرنے کیلئے ذہبی کی میزان الضعفاء اور ابن حجر عسقلانی کی لسان المیزان سامنے رکھے اور غریب الفاظ کی شرح اور عبارتوں کے مفہوم متعین کرنے کیلئے محمد طاہر (گجراتی) کی مجمع البحار سے استفادہ کرے۔"

(عجالہ نافعہ)

(۸)

قرآن مجید کی زبان عربی ہے اسلئے قرآن مجید سے استفادہ کرنے والے کے لئے عربی زبان کی واقفیت سے چارہ نہیں، لیکن یہ بات کبھی نہ فراموش کرنی چاہیئے کہ زبان کے معاملہ میں قرآن مجید کا معیار اس قدر بلند ہے کہ علمائے اسلام کی ایک بڑی جماعت نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت ہی کو اس کے اعجاز کی اصلی وجہ قرار دیا ہے، اسلئے قرآن مجید کے الفاظ اس کے جملوں اور اس کی ترکیبوں کے سلسلہ میں محض سطحی معلومات پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے بلکہ عربی لغت اور اس کے اسالیب بیان کے اعلیٰ مآخذ کو پیش نظر رکھنا چاہیئے تاکہ قرآن مجید کے مضامین سے صحیح استفادہ ہو سکے! اس سلسلہ میں حسب ذیل اشارات خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح کے لئے اہل علم نے دو طریقے اختیار کئے ہیں بعض نے تمام الفاظ کا احاطہ کیا ہے اور اُن کا نام مفردات القرآن رکھا ہے، مثلاً مفردات القرآن، امام راغب اصفہانی۔ ایک جماعت نے صرف مشکل لغات پر اکتفا کی اور اس کو

غریب القرآن کے نام سے موسوم کیا۔ اس فن پر علماء نحو وادب نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں لیکن اس باب میں سب سے زیادہ کاوش وتلاش ابن درید (۳۲۱ھ) اور اُن کے شاگرد عزیزی نے کیا ہے۔ ان دونوں استاد اور شاگرد نے غریب القرآن کی تدوین میں پورے پندرہ برس صرف کئے۔

(۲) قرآن میں اکثر ایک لفظ متعدد مقامات میں مختلف معنی رکھتا ہے۔ اہل بلاغت اس لفظ کو مشترک کہتے ہیں لیکن علوم قرآن میں اس کو "نظائر" کہتے ہیں اور بعض الفاظ ایسے ہیں جو متعدد مقامات پر مستعمل ہوتے ہیں اور ہر جگہ ان سے ایک ہی معنی مراد ہیں علماء قرآن اس کو "وجوہ" کہتے ہیں "وجوہ ونظائر" کی واقفیت فہم معانی قرآن کیلئے نہایت ضروری ہے تاکہ معنی سمجھنے میں اشتباہ نہ ہو اس بناء پر علماء اسلام نے "وجوہ ونظائر" کی توضیح وتحقیق کیلئے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ حافظ جلال الدین سیوطی کا رسالہ "معرک الاقرآن" فی مشترک القرآن" اسی فن میں ہے۔

(۳) عربی زبان میں اجزائے کلام کے باہمی ارتباط وتعلق کے اظہار کیلئے اعراب (یعنی آخری حرف میں زیر، زبر، پیش) کا استعمال ہوتا ہے انہیں اعراب کے ذریعہ سے عربی زبان میں فاعل، مفعول، مضاف، مضاف الیہ حال، تمیز، وغیرہ کا امتیاز ہوتا ہے اسلئے ظاہر ہے کہ فہم معنی کیلئے اعراب کی واقفیت کی کس قدر ضرورت ہے، علمائے اسلام نے یہ ضرورت بھی پوری کر دی ہے قرآن مجید کے اعراب پر بیشمار کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں عموماً ایک ایک سورہ کو بہ ترتیب لے کر ان کے اعراب کی تحقیق کی گئی ہے،

(۴) قرآن مجید جن مطالب پر مشتمل ہے اُن کو کن طریقوں سے ادا کیا گیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں کون مختلف صلات وحروف روابط کو استعمال کیا گیا ہے؟ یہ مختلف

صلاتلہ وحروف روابط معنی میں کیا اثر پیدا کرتے ہیں الفاظ کی تقدیم و تاخیر، تعریف وتنکیر، اطلاق وتقیید وغیرہ سے معانی میں کیونکر اثر پیدا ہوتا ہے، ان تمام امُور کی واقفیت کے بغیر قرآن کے مطالب سمجھنا غیر ممکن ہے اسلئے علمائے ادب نے جن کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کا سب سے زیادہ حق تھا ان مباحث پر معانی قرآن کے نام سے بہ کثرت کتابیں لکھیں۔ قرآن کے طالبعلم کو اس فن سے واقفیت ضروری ہے۔

(۵) جو لفظ جس معنی کیلئے بنایا گیا ہے، اگر اسی میں اس کا استعمال رہے تو اس کو حقیقت کہتے ہیں اور اگر اس عام اور معروف وضع کے ذریعہ سے اس کے مناسب اور غیر معروف معنی کو ادا کیا جائے تو اس کو مجاز کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں بے انتہا مجازات ہیں اور مفسر کیلئے ان سے واقفیت ضروری ہے، مصنفین اسلام نے مجاز القرآن کے نام سے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ سلطان العلماء عزالدین بن عبدالسلام (سنہ ۶۶۰ھ) کی الاشارہ الی الایجاز فی بعض انواع المجاز اس فن کی بہترین تصنیف ہے جس میں نہایت استیعاب کے ساتھ

لہ صلات کا معانی پر جو اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ آیت (وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھاڑ دیا تھا۔ (بقرہ) سے کرنا چاہیئے اس آیت پر ایک ظاہری اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنے عہد کے بنی اسرائیل سے کہہ رہا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑ دیا تھا حالانکہ یہ واقعہ ان کے اسلاف کے ساتھ پیش آیا تھا اس اشکال کے مناسب جوابات دیئے گئے ہیں لیکن صاحب روح المعانی نے کہا ہے کہ اگر "لکم" ہوتا تو اس سے عہد نبوی کے بنی اسرائیل مراد ہوتے اور "ب" سے صلہ یعنی "بکم" کے معنی ہیں کہ تمہارے اسلاف کیلئے دریا پھاڑ دیا تھا۔ اس طرح محض صلہ کے فرق کے باعث کوئی اشکال نہیں وارد ہوتا ہے (روح المعانی ج ا ول صـ۲۱۲)

قرآن کی آیات کا استقصار اور اس کے معانی کی تشریح کی گئی ہے۔

(۶) بہت معانی اور مطالب ایسے ہیں جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں اور جن کی تشریح و توضیح کیلئے ایک دفتر درکار ہوتا ہے لیکن سب سے آسان مختصر اور بہتر صورت اس کی یہ ہے کہ ان کو تشبیہ کے ذریعہ ادا کیا جائے یعنی ان کو ایسے معانی و مطالب کے مشابہ قرار دیا جائے جو عام طور پر معلوم ہیں اور نظروں کے سامنے ہیں، تاکہ مخاطب ان واضح اور ظاہر معانی سے بواسطۂ مشابہت مخفی معانی تک پہنچ جائے۔ اسی کو تشبیہ کہتے ہیں۔

قرآن مجید نے بھی تشبیہات کا استعمال کیا ہے اور ان تشبیہات پر، عام کتب بیان نیز فن معانی القرآن، فن اعجاز القرآن اور فن مجاز القرآن میں کامل بحثیں موجود ہیں۔ جن کا مطالعہ طالب قرآن کے لئے ناگزیر ہے۔

(۷) قرآن مجید میں ایک ہی مادہ، مختلف ابواب سے استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابواب کا یہ تغیر کسی معنوی افادہ سے خالی نہیں

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ الفاظ کی زیادتی و قوت کو معنی کی قوت اور اہمیت میں بہت ہی زیادہ دخل ہے جیسا کہ مصنف طراز فرماتے ہیں۔

"معنی میں زور و قوت کا جو ظہور ہوتا ہے وہ الفاظ کی وجہ سے ہوتا ہے اور الفاظ میں یہ قوت صیغوں کے ردّ و بدل کی وجہ سے آتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر الفاظ کی کمی زیادتی کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا اس لئے معنی میں قوت پیدا کرنے کے لئے الفاظ کی زیادتی لازمی ہے"[1]

مزید وضاحت کے لئے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

---

[1] کتاب الطراز ج ۲ ص ۱۶۳

علام الغیوب اور عالم الغیوب میں بہت فرق ہے۔ علام زیادہ جاننے والے کو کہیں گے اور عالم صرف جاننے والے کو، اسی طرح یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ اور یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۔ میں جو زور بیان پایا جاتا ہے وہ تائبین اور طاہرین میں نہیں پایا جاتا کیونکہ توّاب ہمہ وقت توبہ کرنے والے کیلئے مستعمل ہے اور تائب صرف توبہ کرنے والے کو کہتے ہیں[1]"

(۱) ایک آیت ہے۔ فَمَا اسْطَاعُوْا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا" اس میں بھی الفاظ کی زیادتی سے معنی میں تبدیلی واقع ہوگئی ہے، کیونکہ "ت" حروف شدت میں سے ہے اور اسی وجہ سے یہ واضح ہوگیا کہ اہم مہم اور سخت کام کے لئے استطاع کا لفظ مستعمل ہوگا، اور آسان وسہل کام کے لئے اسطاع۔ کیونکہ فَمَا اسْطَاعُوْا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ کے معنی یہ ہے کہ اپنے ضعف کی وجہ سے وہ اس پر غلبہ نہ کرسکے۔ اور وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا کے معنی یہ ہیں کہ شدت اور سختی کی وجہ سے وہ سوراخ نہ کرسکے[2]

(۲) دوسری آیت عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ میں "تختانون" کا باب افتعال سے آنا بہت ہی پُرمعنی ہے۔ بظاہر آیت صرف یہ بتارہی ہے کہ صحابۂ کرام (نعوذ باللہ) خیانت کے مرتکب ہوتے تھے بعض فرق ضالہ نے تو اسی آیت کو لے کر صحابہ کرامؓ کے خلاف طعن و تشنیع کی ایک

---

[1] الطرازج ۲ ص ۱۶۳ [2] التاج المکلل ص ۲۰۲

مہم شروع کردی۔ لیکن جب لغت پر نظر ڈالی گئی تو قرآن کے اعجاز کا قائل ہونا پڑا کیونکہ اختیان کہتے ہیں خیانت کا ارادہ کرنے کو! یعنی خیانت کے خیال اور تصور کو اختیان کہا جاتا ہے اور خیانت کرنے کے معنی میں جو لفظ مستعمل ہوتا ہے وہ یَخُوْنُوْنَ ہے نہ کہ یَخْتَانُوْنَ اور خیانت کا تصور وخیال کوئی بڑی بات نہیں ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ (نفس ہی برائیوں کی طرف کثرت سے راغب کرتا ہے[۱]۔)

حاصل یہ کہ قصد فعل دوسری چیز ہے اور صدور فعل دوسری چیز! قرآن مجید کا اشارہ قصد ہی کی طرف ہے صدور کی طرف نہیں اسلئے یہ آیت صحابہؓ کرام کے مناقب کے ذیل میں آتی ہے کہ باوجود قصد کے ان سے اس کا ارتکاب نہیں ہوا۔

(۳) اللہ تعالیٰ اپنے لطف وکرم کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ یعنی ان کو کار خیر میں تو ثواب مل جائے گا لیکن سزا اسی وقت ملے گی جب کوئی گناہ قصداً سرزد ہوا ہو۔ اتنا عظیم فرق صرف اس ایک "ت" کی زیادتی سے پیدا ہوگیا، حالانکہ دونوں کا مادّہ ایک ہی ہے اس لئے کہ اکتسبت باب افتعال سے ہے جس میں قصد وارادہ ضروری ہے[۲]۔

(۴) حضرت زکریّا کے بارے میں ارشاد ہوا۔

سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ حصر کے لغوی معنی روکنے کے ہیں حصور اسی سے مشتق ہے لیکن یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لئے اس کے اور حصر کے معنی میں بالکل مغائرت ہوگی۔ علامہ خفاجی فرماتے ہیں۔

---

[۱] المفردات فی غریب القرآن للراغب ص ۱۶۳ [۲] کتاب الطراز ج ۲ ص ۱۶۴ - ۱۶۵

"حصور مبالغہ کا صیغہ ہے اور مبالغہ صرف اختیاری افعال ہی میں پایا جاتا ہے لہٰذا حصور کے معنی ہیں "قدرت کے باوجود محصور رہنا"

اس لئے معلوم ہوا کہ زکریا علیہ السلام مجبوراً محصور نہیں تھے بلکہ اُن کا یہ اپنا اختیاری فعل تھا۔

(۵) سورۂ قدر میں ارشاد ہے:۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ۔

اس شب میں ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ تنزل باب تفعل سے ہے جس کی خاصیت تدریج ہے یعنی کسی شے کا آہستہ آہستہ پورا ہونا مصنف فتوحات الٰہیہ فرماتے ہیں:۔

"آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام فرشتے اس شب میں دنیا میں آجاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس شب میں فرشتوں کے اُترنے کے بارے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں لیکن تنزل کا لفظ لاکر فرشتوں کے نزول کی نوعیت متعین کر دی کہ وہ یک بیک نہیں اترتے رہتے بلکہ جوق در جوق یکے بعد دیگرے اترتے رہتے ہیں جس طرح حجاج جوق در جوق خانۂ کعبہ کی حاضری کیلئے آتے ہیں[۱]"

(۶) منافقین کے بارے میں خدا کہتا ہے ۔ وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ۔

یہاں معتذرون نہیں فرمایا گیا کیونکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ مُعَذِّر صرف اس شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو معذور نہ ہو مگر خواہ مخواہ اپنے آپ کو معذور گردانے اور معتذر صحیح اور غیر صحیح دونوں قسم کے عذروں کے لئے آتا ہے۔ قرآن نے

---

[۱] شرح شفاء للشہاب ص ۵۶۵

مُعَذِّرُوْنَ کا لفظ استعمال کر کے یہ بتا دیا کہ منافقین حقیقتاً معذور نہیں تھے [1]

(۷) وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ۔ اس آیت کے تفسیری مباحث اہل علم کے سامنے ہیں لیکن یُطِیْقُوْنَہٗ کے باب افعال سے آنے کے اسرار پر غور کیجئے تو بحث کس قدر آسان ہو جاتی ہے۔ باب افعال کی ایک خاصیت سلب ماخذ ہے اسلئے یطیقونہ، کے معنی لَا یُطِیْقُوْنَہٗ ہوئے اب مفہوم میں کسی قسم کا اشکال نہیں رہا یعنی جو روزہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ اس کے بدلے فدیہ ادا کریں۔

لسان العرب کے مصنف فرماتے ہیں کہ طوق اور اطاقۃ مشقت یا تکلیف کے ساتھ طاقت رکھنے یا برداشت کرنے کو کہتے ہیں تو اب آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے پر قادر تو ہیں لیکن اس میں انہیں مشقت اور تکلیف ہوتی ہے تو وہ اپنے روزے کے لئے فدیہ ادا کریں۔

اسی مفہوم کی تائید میں شرح ابوداؤد میں اس آیت کی تفسیر میں اطاقۃ کے معنی یہ لکھے ہوئے ہیں کہ وہ لوگ جو روزہ رکھنے پر مشقت و تکلیف کے ساتھ قادر ہوں ان کو اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کے بدلے میں فدیہ ادا کریں۔

(۹)

تصریحات بالا سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن شریف کی تفسیر کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ آیات قرآنیہ کی توضیح قرآن ہی سے کی جائے۔ اس کے بعد احادیث صحیحہ کو پیش نظر رکھا جائے اور اگر زبان عرب کے قواعد کی پابندی اور اصول شریعت کی مطابقت کے ساتھ قرآن مجید کے معانی بیان کئے جائیں تو وہ بھی تفسیر کا صحیح طریقہ ہے اور اگر آیات قرآنیہ کے

---

[1] الجمل ج ۴ ص ۵۶۶

مطلب کے بیان کرنے میں اصول شریعت اور قواعد زبان عرب کا لحاظ نہ کیا جائے تو یہ ناجائز ہے اور اسی کو "تفسیر بالرائے" کہتے ہیں۔

ترمذی شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کہے تو چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں ڈھونڈ لے"

اور دوسری روایت میں ہے کہ

"جو شخص قرآن میں بغیر علم کے کچھ کہے تو چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں ڈھونڈ لے"

یہاں علم سے مراد قواعد عربیت اور اصول شریعت کا علم ہے بے شبہ جو شخص ان دونوں علوم سے ناواقف ہے اس کو قرآن شریف کی تفسیر کرنا حرام ہے۔ علامہ شاطبی نے موافقات میں صحیح فرمایا کہ

"رائے کی دو قسمیں ہیں ایک وہ رائے جو کتاب سنت کے مطابق اور قواعد زبان عرب کے موافق ہو۔ اس رائے سے اعراض وغفلت ممکن نہیں ہے"

دوسری رائے وہ جو نہ دلائل شرعیہ کے موافق ہے اور نہ زبان عرب کے قواعد کے مطابق ہو تو بے شبہ یہی رائے قابل مذمت ہے"

(ج-۳)

جصاص رازی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد۔

من قال فی القرآن برایۃ فاصاب فقد اخطاء۔	جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہے وہ اگر صحیح بھی کہے تو غلط ہے۔

اس شخص کے متعلق ہے جو قرآن کی تفسیر میں اصول سے ہٹ کر وہ بات کہے جو اس کے خیال میں آجائے اور اگر کوئی شخص (آیات قرآنیہ کا) مطلب بیان کرے اور اس کو ایسے معانی پر محمول کرے، جن پر سب کا اتفاق ہے تو وہ شخص قابل تعریف ہے، اجر کا مستحق ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق خدا نے ارشاد فرمایا:۔

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔ (ج ۲ ص ۸۸)

(۱۰)

قرآن مجید کے طالبعلم کے لئے ضروری ہے کہ اس کو قرآن مجید میں جن قوموں کا ذکر آیا ہے اور جن مذاہب سے خطاب فرمایا گیا ہے اُن سے نیز عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ سے گہری واقفیت ہو۔ یہ مطالعہ جتنا گہرا ہوگا اسی قدر آیات قرآنیہ کا صحیح انکشاف ہوگا۔

صورت یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے زمانہ نزول کے چار گمراہ فرقوں، مشرکین، یہود، نصاریٰ اور منافقین کو خصوصی طور سے مخاطب کیا ہے اُن کے عقائد پر تنقید کی ہے اور اعمال واخلاق کی پردہ دری کی ہے، اب جس شخص کو ان فرقوں کے عقائد کی واقفیت نہیں ہے یا جس کی نگاہوں میں ان کی اخلاقی اور سیاسی زندگی نہیں ہے وہ متعلقہ آیات میں اسلوب بیان اور طرز خطاب کی اہمیت اور استدلال کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے مسلمانوں کو خطاب کیا ہے۔ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات میں اُن کی رہنمائی کی ہے۔ غزوات اور اس وقت کے اہم واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ اب اگر زمانہ نزول قرآن کی تاریخ سے کوئی شخص ناواقف ہے تو وہ آیات کو ان کے صحیح

محل پر نہیں رکھ سکتا ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ کسی موقع پر غلطی کا ارتکاب نہ ہو جائے۔

اسی لئے امام شاطبی نے موافقات (ج-۳) میں فرمایا کہ

"جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہے اس کیلئے نزول کی معرفت ضروری ہے۔"

اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے امام شاطبی نے بڑی لطیف بات کہی کہ فن معانی وبیان کی بنیاد اس پر ہے کہ نفس خطاب مخاطب کرنے والے اور جس کو مخاطب کیا گیا ہے، اس کے متعلق صحیح معلومات ہوں، اسی کو مقتضائے حال کہتے ہیں۔ اسباب نزول کی واقفیت کا مطلب اسی مقتضائے حال کا جاننا ہے، شاطبی نے کہا بسا اوقات اس مقتضائے حال سے ناواقفیت سخت اشکالات کا باعث بنتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں مسلمانوں کے حالات اور قرآن کے مخاطب فرقوں کے عقائد رسوم اور عادات سے واقفیت ازبس ضروری ہے ۔ امام شاطبی نے فرمایا کہ :-

"(طالب قرآن کو) عادات عرب سے ناواقفیت بعض اوقات ایسی مشکلات میں ڈال دیتی ہے کہ اس سے نجات کی شکل اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی کہ اس ناواقفیت کو دور کیا جائے۔"

(۱۱)

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے بھی قرآن کا مطالعہ کیا ہے مگر ظاہر ہے کہ بالعموم ان کا نقطۂ نظر اعتراض، یا قرآنی آیات اور قرآنی الفاظ کو اپنے کسی مطلب کے لئے استعمال کرنا اور مسلمانوں کو فریب دینا ہوتا ہے اس لئے قرآن مجید کے طالبعلم کو اس باب میں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، وضاحت کی غرض سے ہم اس

مسئلہ کی صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "اللہ کا کلمہ" کہا گیا ہے ارشاد فرمایا۔

وَكَلِمَتُهٗۤ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ (نساء) اور اللہ کا کلمہ ہیں جس کو اللہ نے مریم تک پہنچایا۔

عیسائیوں نے مسلمانوں کو اس لفظ سے ہمیشہ کسی نہ کسی فریب میں مبتلا کرنا چاہا ہے۔ عباسی عہد کے فتنۂ خلق قرآن میں بھی اسی لفظ کا تماشا نظر آتا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اہل سنّتہ والجماعت کا عقیدہ ہے کہ کلام اللہ غیر مخلوق ہے نصاری اس پر اعتراض کرتے تھے کہ جب کلام اللہ غیر مخلوق ہے تو "مسیح" جو کلمۃ اللہ ہیں وہ بھی غیر مخلوق ہیں[1]۔

معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ کو کلام اللہ کے مخلوق ہونے پر جو اس قدر اصرار تھا وہ عیسائیوں کے اسی اعتراض سے بچنے کی بنا پر تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ نصاریٰ کلمۃ اللہ کے لفظ سے حضرت مسیح علیہ السلام کے غیر مخلوق ہونے پر استدلال کرتے تھے اور جہمیہ اسی لفظ سے قرآن کے مخلوق ہونے کو ثابت کرتے تھے ان کا استدلال یہ تھا کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کہا ہے اور حضرت عیسیٰ مخلوق ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ کلام اللہ بھی مخلوق ہے[2]۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے نصاریٰ اور جہمیہ دونوں کے اقوال کو رد کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیطرف جن اُمور کا انتساب کیا جاتا ہے ان کا انتساب قرآن کی طرف ممکن نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ بچہ تھے جوان ہوئے کھاتے پیتے تھے۔ امر و نہی کے مخاطب تھے۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ پھر کیا

---

[1] الجواب الصحیح ابن تیمیہ ج اول صفحہ ۳۰۰ مصر۔ [2] کتاب الرد علی الجہمیہ امام احمد بن حنبلؒ۔

قرآن مجید کے متعلق ان اُمور کی نسبت ممکن ہے؟

مطلب یہ ہوا کہ قرآن پاک اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ باقی رہا قرآن مجید کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کہنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے "کلمۂ کُن" سے پیدا ہوئے نہ یہ کہ وہ خود کلمہ تھے[1]

اصل قصہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے جب اپنے صحیح دین کو کھو دیا اور دوسرے مذاہب نیز اہل فلسفہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو عیسوی مسائل میں ایسی لچک پیدا کرنا شروع کر دی کہ ہر مذہب و مسلک کے لوگ اُن کے دین میں گنجائش پا سکیں چنانچہ انہوں نے دیکھا کہ فلاسفہ عقل، عاقل اور معقول کے اتحاد کے قائل ہیں تو انہوں نے بھی باپ بیٹے اور روح القدس کا نقشہ اپنے یہاں کھینچ لیا۔

خالص یونانی فلسفہ لوگس (LOGOS) کے نام سے ایک اولین ہستی کو تسلیم کیا ہے جس کو اللہ نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ بنایا ہے اسی کو فلاسفہ، عقل اوّل، سے تعبیر کرتے ہیں۔

عیسائیوں نے لوگس کے اسی تخیل کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چسپاں کر کے بت پرست یونانی فلسفیوں کو دین عیسوی میں شامل کرنے کی کوشش کی لیکن اس اندھی تقلید میں وہ خود گمراہ ہو گئے۔

عیسائیوں نے فلاسفہ کی طرح جب مسلمانوں کو اپنے دام میں لانا چاہا تو لوگس کے اسی تخیل کو قرآنی لفظ کلمۃ اللہ کے ذریعہ سے ادا کرنا چاہا۔

ظاہر ہے کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ جو کہا ہے اسکو عیسائی

---

[1] الرد علی الجہمیۃ۔

عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ خود اصل دین عیسوی بھی اس سے بری ہے، عیسائیوں نے کلمۃ اللہ کے تحت میں جتنے عقیدے پیدا کئے ہیں وہ سب کے سب مصر اور یونان کے بت پرست فلاسفہ سے ماخوذ اور توحید کے خلاف ہیں۔

قرآن میں کلمۃ اللہ کا مفہوم

اب دیکھنا چاہیئے کہ قرآن پاک نے "کلمہ" کو کس معنی میں استعمال کیا ہے؟

قرآن پاک نے کلمہ کا اطلاق ایک "قول تام" پر کیا ہے[1]۔ یہ قول تام کہیں صرف بات کے معنی میں ہے۔ ارشاد ہوا۔

(۱) وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ۔ (کہف ۱)

اور تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جو یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے تو اس کی کوئی دلیل اُن کے پاس نہیں ہے۔ بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

اس آیت میں قرآن نے قول (اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا) کو کلمہ کہا ہے۔

(۲) قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط (آل عمران)

آپ فرما دیجئے کہ اہل کتاب آؤ۔ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلم ہونے میں) برابر ہے کہ بجز اللہ تعالیٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے اللہ کو چھوڑ کر۔

---

[1] الجواب الصحیح ابن تیمیہ جلد ۲ ص ۱۶۲۔ الرد علی المنطقیین ابن تیمیہ ص ۱۲۳ قلمی۔

اس آیت میں یہ پوری بات (اَن لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ الخ) کلمہ ہے۔

(۳) حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَھُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ لَعَلِّیۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَکۡتُ کَلَّا ؕ اِنَّہَا کَلِمَۃٌ ہُوَ قَآئِلُہَا ؕ (مؤمنون ۶)	یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی پر موت آتی ہے اس وقت کہتا ہے کہ "اے میرے رب مجھ کو پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس کو میں چھوڑ رہا ہوں، اس میں نیک کام کروں"۔ "ہرگز نہیں"۔ بیشک وہ ایک بات ہی ہے جس کو وہ کہے جا رہا ہے۔

یہاں قول رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ لَعَلِّیۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَکۡتُ " کلمہ ہے"۔

لفظ کلمہ کے دوسرے معنی "طے شدہ بات" امر مقدر کے ہیں یعنی وہ بات جو علم الٰہی میں پہلے طے ہو چکی ہے۔ آیات ذیل اس کی شاہد ہیں۔

وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۚۖ اِنَّہُمۡ لَہُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ۪ وَاِنَّ جُنۡدَنَا لَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ۔ (صافات ۵)	اور ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے ہماری بات پہلے ہی سے مقرر ہو چکی ہے کہ بیشک وہی غالب کئے جائیں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب رہتا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ بات کہ پیغمبروں کو کامیابی اور خداوندی لشکر کو غلبہ ہوگا۔ پیشتر ہی اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اسی کو سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا سے ادا فرمایا۔

کَذٰلِکَ حَقَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّہُمۡ اَصۡحٰبُ النَّارِ۔	اسی طرح تمام کافروں پر آپ کے رب کی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ لوگ دوزخی ہوں گے۔ (مومن)

یعنی کافروں کا دوزخی ہونا اللہ کے نزدیک ایک امر ثابت ہے اس کے لئے
حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ۔ (اعراف ۱۶)

اور ہم نے اُن لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے۔ اس سرزمین کے پورب اور پچھم کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے اور آپ کے رب کی بھلی بات بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پوری ہوگئی۔

گویا بنی اسرائیل کا صبر کے باعث مصریوں کے مقابلہ میں کامیاب ہونا اور زمین کا وارث بننا اللہ کے نزدیک ایک ہونے والی بات تھی جو ہو کر رہی اسی کو كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى سے ظاہر فرمایا۔

اہل فسق اپنے تمرد اور سرکشی کی وجہ سے ایمان نہ لائیں گے یہ بات اللہ کے نزدیک مسلّم ہے اسی کو حقت كَلِمَة رَبِّكَ سے یوں ادا کیا۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (یونس ۴)

اسی طرح آپ کے رب کی یہ (ازلی) بات کہ ایمان نہ لائیں گے تمام سرکش لوگوں کے حق میں ثابت ہو چکی ہے۔

ان تمام تشریحات کے بعد قرآن پاک کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو كَلِمَةُ اللّٰه کہنے کا مقصد واضح ہو جاتا ہے یعنی بغیر باپ کے پیدا ہونا علمُ الٰہی میں ایک طے شدہ بات تھی۔

اسی طے شدہ بات کو قرآن پاک نے (امر مقضی) کہہ کر بالکل صاف کر دیا ہے فرمایا۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَّلَـمْ

حضرت مریم کہنے لگیں بھلا میرے لڑکا کس

يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا۔ (مریم ۲)

طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا اور نہ میں بدکار ہوں فرشتے نے کہا یوں ہی ہو جائے گا تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ یہ بات مجھ کو آسان ہے اور (اس طور پر اس لئے پیدا کریں گے) تاکہ اس فرزند کو ہم لوگوں کے لئے ایک نشانی اور رحمت کا سبب بنائیں اور یہ ایک طے شدہ بات ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام "کلمۃ اللہ" اس لئے ہوئے کہ ان کا اسطرح پیدا ہونا ایک امر مقدر اور طے شدہ بات تھی۔

کلمۃ اللہ اور بائیبل

بائیبل کے عربی تراجم میں بھی ایسی آیات موجود ہیں جن میں کلمہ کا وہی مفہوم ہے جو قرآن کا مفہوم ہے یعنی کلمہ بہ معنی بات، حکم اور امر مقدر۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) امور الثالث والعشرون آیت ۶

بِكَلِمَةِ الرَّبِّ صَنَعَتِ السَّمٰوٰاتِ۔ اللہ کے کلمے سے آسمان بنے۔

(۲) اخبار الایام الاول باب ۱۷ آیت ۳

حلت كلمة اللهِ على تاتان النبى۔ اللہ کا کلمہ تاتان نبی کے پاس پہنچا۔

(۳) کتاب ھوسیع باب اول۔

كلمة الرب التى صارت الى هوسيع۔ اللہ کا کلمہ جو ہوسیع کے پاس پہنچا۔

(۴) لوقا باب ۲ آیت ۳۱

حلت کلمۃ الرّب — اللہ کلمہ یوحنا بن زکریا۔

علی یوحنّا بن زکریا — کے پاس پہنچا۔

کلمۃ اللہ اور کلمۂ تکوین اس سلسلہ میں یہ امر بھی ذہن نشین کر لینے کے قابل ہے کہ مفسرین عموماً کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کلمۂ تکوین یعنی کن (ہوجا) سے ہوئی جس طرح سارے عالم کی تکوین اسی کن (ہوجا) کے حکم سے ہوتی ہے۔ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْن۔ (مریم) (جس کام کو پورا کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہوجا پس وہ ہوجاتا ہے۔)

اسلئے حضرت عیسیٰ کلمہ اللہ کہے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کلمۃ اللہ وہی امرِ مقدر ہے اور کلمۂ تکوین اس امر مقدر میں تصرف کیلئے تعبیر ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی کلمۂ تکوین کو عالم میں تصرف ارادی سے تعبیر کیا ہے[1]۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ اس لئے نہیں کہا ہے کہ وہ اللہ کی صفت کلام ہیں جو ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہے، یا ذات الٰہی میں ہیں یا ذات الٰہی ہیں جیسا کہ عیسائیوں کا بیان ہے بلکہ اس لئے کہا ہے کہ جسطرح وہ حضرت مریمؑ کے پیٹ سے مستثنیٰ اشکل میں پیدا ہوئے۔ یہ پیدائش اللہ تعالیٰ کا امر مقدر تھا، جس کا ظہور حکم الٰہی سے ہوا۔

---

[1] الفوز الکبیر بحث شرک ۱۲۔

سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے اپنا امر مقدر یا طے شدہ یا بحکم الٰہی ان کی پیدائش کیوں بنایا اور ان کی روح کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ یہود حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر جو الزام لگاتے تھے کہ حضرت مریم (نعوذ باللہ منہ) مرتکب حرام ہوئی تھیں اور حضرت عیسیٰ نعوذ باللہ ولد الحرام تھے۔ اس الزام کو دور فرما کر دونوں کی پاکی اور طہارت کے اظہار کیلئے اللہ تعالیٰ نے انکو پیدائش کے طریق کو اپنا حکم تقدیری اور اپنی جانب سے بخشی ہوئی روح زندگی فرمایا اور حضرت مریمؑ کی نسبت ارشاد فرمایا۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ۔ (تحریم ـ ۲)	اور مریم بنت عمران جس نے اپنی شرمگاہ کی محافظت کی، پس پھونکا ہم نے اس میں اپنی روح سے اور مانتی تھی اپنے رب کی باتوں کو اس کی کتابوں کو اور تھی وہ فرمانبرداروں میں سے۔

(۱۲)

"مستشرقین یورپ" جن کے فضل و کمال کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا اور جن کی تلاش و تحقیق کا رعب دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔ وہ اسلام کی عداوت میں کبھی ایسی عامیانہ اور جاہلانہ روش اختیار کرتے ہیں جس پر سطحی معلومات والا انسان بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مشہور جرمن محقق و مستشرق نولڈیکی جس کے علمی افلاس کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآن پاک کو (نعوذ باللہ) تصنیف محمدیؐ بتلاتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا[1] میں قرآن مجید پر ریویو کرتے ہوئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے کہ

---

[1] جلد ۱۵ ص ۹۰۰ طبع یازدہم کیمبرج یونیورسٹی۔

"عرب سے تو نہیں واقفیت تھی لیکن بیرون عرب کا جہاں ذکر کرتے ہیں وہاں ان کی بے خبری (لفظ کا اصلی ترجمہ جہالت ہے) کی پردہ دری ہوجاتی ہے چنانچہ مصر کی زرخیزی کو جہاں کہ بارش تقریباً نہیں دیکھی جاتی ہے وہ دریائے نیل کے سیلاب کے بجائے بارش پر منحصر رکھتے ہیں"

واقعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب قیدخانے میں تھے تو مصر کے بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں اور سات شاداب بالیں ہیں اور سات خشک، خشک بالوں نے سبز کو کھالیا۔ شاہ مصر کے خواب کی حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی جس کو قرآن پاک نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے:۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَأَبًاۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَ فِیْهِ یَعْصِرُوْنَ۔ (یوسف - ۶)

آپ نے فرمایا کہ تم سات سال متواتر غلہ بونا پھر جو فصل کاٹنا اسے بالیوں میں رہنے دینا ہاں مگر تھوڑا سا جو تمہارے کام میں آئے پھر اس کے بعد سات برس ایسے سخت آئیں گے جو کہ اس ذخیرے کو کھاجائیں گے جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کیا ہے مگر تھوڑا سا جو تم رکھ چھوڑو گے پھر اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا جسمیں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی ویا فریادرسی ہوگی اور اس میں شیرہ بھی نہ نچوڑیں گے۔

اس تعبیر میں ایک لفظ (یغاث) ہے عموماً جس کا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ بارش ہوگی۔ جرمن "مستشرق" کے نزدیک مصر کے سلسلہ میں بارش کا ذکر نعوذ باللہ صاحب قرآن کی بے خبری کی دلیل ہے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

بے خبر انسان کو خدائے علیم و خبیر کے کلام پر تنقید کی جرأت؟ ذیل کی سطروں میں اسی تنقید کی اصل حقیقت آشکارا کی گئی ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ "یُغاث" کے معنی صرف پانی برسنے کے نہیں ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ غیث (بمعنی بارش) سے مشتق نہیں ہے بلکہ اس کا مادہ غوث ہے جس کے معنی "فریادرسی" کے ہیں یعنی اس قحط کے بعد ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریادرسی ہوگی اور قحط دور ہوگا۔ اس قحط کے خاتمہ کا سبب بارش ہوگی۔ یا نیل کا سیلاب؟ اس کا یہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

روح المعانی[۱] میں ہے۔

ای یصیبھم غیث ای مطر کما قال	یعنی اُن کو پانی پہنچے گا جیسا کہ ابن عباس
ابن عبّاس و مجاھد والجمھورُ فھو	مجاہد اور جمہور نے کہا ہے اس وقت
من غاث الثلاثی الیائی وقیل ھو	اس کا مادہ غیث ہوگا اور کہا گیا
من الغوث ای الفرج یقال أغاثنا	ہے کہ اس کا مادہ غوث ہے یعنی فریادرسی
اللہ تعالیٰ اذا امدّنا برفع المکارہ	اور مصیبت کا دور کرنا کہا جاتا ہے اغاثنا اللہ
حین اظلتنا فھو رباعی	جب کہ اللہ ہماری مصیبتوں کو دور کر دے۔

---

[۱] روح المعانی ج ۱۲ ص ۲۲۹۔

وادی۔

قاضی بیضاوی کہتے ہیں[1]۔

یمطرون فیه من الغیث او یغاثون من القحط من الغوث۔	بارش ہوگی جب کہ مادہ غیث ہو اور اگر مادہ غوث ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قحط ان سے دور کیا جائے گا ان کی فریادرسی ہوگی۔

ثعالبی کی جواھر الحسان فی تفسیر القرآن[2] میں ہے۔

جائز ان یکون من الغیث وھو قول ابن عباس وجمھور المفسرین۔	جائز ہے کہ غیث سے ہو جیسا کہ ابن عباسؓ اور جمہور مفسرین کا قول ہے۔
ای یمطرون وجائز ان یکون من اغاثھم الله اذا فرج عنھم ومنه الغوث وھو الفرج۔	یعنی بارش ہوگی اور جائز ہے کہ غوث سے ہو جس کے معنی فریادرسی کے ہیں یعنی ان کی مشکل دور کی جائے گی۔

(۲) اور اگر عام مفسرین کے مسلک کے مطابق بارش ہی کے معنی لئے جائیں تو بھی فاضل مستشرق کا یہ دعویٰ کہ مصر میں بارش بالکل نہیں ہوتی ہے، غلط ہے۔ بارش کم سہی لیکن اس کا مطلقاً انکار خلاف واقعہ ہے۔

یعقوبی کتاب البلدان میں کہتا ہے کہ مصر میں سواحل پر کس[3] قدر بارش ہوتی ہے۔ الحضارۃ المصریہ[4] میں ہے کہ یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ وادی نیل بارش سے محروم ہے۔ ای مارسڈن وٹی آسفورڈ اسمتھ کے جغرافیہ عالم میں ہے[5]۔

---

[1] بیضاوی ج اول ۳۹۹ [2] جواہر الحسان ج ۲ ص ۲۴۱ [3] کتاب البلدان ص ۳۴۰ [4] الحضارۃ المصریہ ص ۸ [5] جغرافیہ عالم ج ۲ ص ۱۶۳ حیدر آباد۔ تقویم البلدان ص ۱۱۸۔

"بارش یہاں بہت ہی کم یعنی قاہرہ میں ایک اپنچ سالانہ اور اسکندریہ جو سمندر سے متصل واقع ہے ۱۸ انچ سالانہ سے زیادہ نہیں ہوتی"

(۳) مصر کے وہ مقامات جہاں فراعنہ مصر کا قیام تھا ان کا بارانی ہونا تو بہر حال ثابت ہے چنانچہ مصر کے سواحل اور قاہرہ جو ساحل دریائے نیل پر چودہ میل مربع رقبہ میں آباد ہے وہاں بارش کا ہونا معلوم ہو چکا ہے، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ فراعنہ مصر کا قیام قاہرہ سے قریب ہی منفؔ اور عین شمسؔ میں رہا کرتا تھا۔

ابو الفداء کی تقویم البلدان میں ہے کہ عین شمس کو مدینہ فرعون کہا جاتا ہے اور یہ قاہرہ سے نصف مرحلہ پر واقع ہے[1]۔

یاقوت نے معجم البلدان میں منف کو فرعون کا شہر بتلایا ہے اور یہاں کے آثار قدیمہ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا مکان تھا۔ یہیں فرعون کا قیام بھی رہا کرتا تھا اور یہیں فرعون کا عین شمس تھا اور اس وقت فسطاط کا جو محلِ وقوع ہے وہ عینؔ شمس اور منفؔ کے درمیان ہے[2]۔

اصل یہ ہے کہ عین شمس ایک ہیکل تھا لوگ اس کی زیارت کو آتے تھے پھر یہاں آبادی قائم ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس آبادی نے شہر کی حیثیت اختیار کر لی ورنہ یہ منفؔ سے الگ نہیں ہے[3]۔

خطط مقریزی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام اور پورے خاندان کو جس میں ۷۳ مرد اور عورتیں شامل تھیں فرما اور عین شمس کے درمیان ٹھہرایا تھا اور یہاں کی زمین بہت شاداب ہے[4]

---

[1] تقویم البلدان ص ۱۱۸ [2] معجم البلدان ج ۴ ص ۱۸۱ [3] مقریزی ج ۱ ص ۳۱۸ [4] مقریزی ج ۱ ص ۲۹۷۔

اب بھی عین شمس قاہرہ کے مضافات میں موجود ہے مسلمان اس کوعون اور یونانی لوگ ھیلوپوس کے نام سے یاد کرتے ہیں اب یہاں بڑے بڑے مکانات اور شاندار ہوٹل ہیں، قاضی ولی محمد صاحب اپنے سفرنامۂ مصر ۱۹۲۴ء میں لکھتے ہیں۔

"کہتے ہیں کہ اس جگہ کو حضرت موسیٰ کی اقامت کا شرف حاصل ہوا تھا اور فرعون کا محل بھی یہیں کہیں تھا اور یہیں عزیز مصر کے بنگلہ میں زلیخا رہتی تھی اس جگہ کوئی ہیکل شمسی تھا جہاں آفتاب پرستی ہوتی تھی[1]"

ان تفصیلات سے معلوم یہ ہوا کہ فراعنۂ مصر قاہرہ کے قریب ہی آباد تھے اور وہاں بارش ہوتی تھی اسلئے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب میں اگر بارش کا ذکر کیا جائے تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہے۔

(۴) محقق مستشرق نے مصر کی زرخیزی کو دریائے نیل پر منحصر رکھا ہے۔ لیکن اس پر غور نہیں کیا کہ خود دریائے نیل کا پانی بھی بارش ہی کے پانی کا نتیجہ ہے۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ مصر کے اور اس کے دیہاتوں کا کام نیل سے چلتا ہے اور نیل کے پانی میں بارش کے اس پانی سے زیادتی ہوتی ہے جو گرمی میں برستا ہے۔

الحضارۃ المصریہ میں ہے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ نیل کا فیضان اُس بارش کا نتیجہ ہے جو بارش مارچ میں وسط افریقہ میں ہوتی ہے جہاں کہ دریائے نیل کا منبع ہے اور وہاں سے مصر کی طرف یہ پانی سرسبزی اور شادابی لے کر آتا ہے[2]۔

---

[1] سفرنامہ مصر ص ۱۱۴ [2] الحضارۃ المصریۃ ص ۸۔

عہد حاضر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا مرحوم جن کی پوری زندگی تقریباً مصر ہی میں گزری وہ اپنی تفسیر[1] میں فرماتے ہیں کہ مصر کو بارش کے پانی سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کی زندگی بارش سے نہیں بلکہ نیل کے پانی سے ہے حالانکہ خود نیل کا پانی بارش ہی کا ممنون ہے۔ نیل کا فیضان اور اس کی کمی درحقیقت ان مقامات کی بارش پر منحصر ہے جہاں سے نیل میں پانی آتا ہے اس ضمن میں علامہ مرحوم نے قرآن پاک کی آیت نقل فرمائی ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ (زمر ۲)

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین کے سوتوں میں داخل کر دیتا ہے۔

• اس کے بعد فرمایا کہ وہ چھوٹے دریا جو نیل کے "ینابیع" ہیں وہ بارش ہی کے پانی سے ہیں یہاں فرعون کا وہ مقولہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جس کو قرآن پاک نے نقل کیا ہے۔

اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهَارُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ۔

اے میری قوم! کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے اور یہ نہریں میری پائیں میں بہہ رہی ہیں)۔

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی دوسری آیت بھی قابل توجہ ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی بتائی ہے کہ ہم ان مقامات پر پانی پہنچاتے ہیں جہاں بارش نہیں ہوتی یا اگر ہوتی ہے تو اس قدر کم کہ اس سے پورا نفع نہیں اٹھایا جا سکتا ہے۔ فرمایا:۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى

کیا انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم

---

[1] جلد ۲ ص ۶۵

الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ۔ (سجدہ ۳)

خشک اُفتادہ زمین کی طرف پانی پہنچاتے ہیں۔ پھر اس کے ذریعے سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس سے اُن کے مواشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا وہ دیکھتے نہیں ہیں؟۔

مفسر ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس سے "ارض جرز" کے یہ معنی نقل کیے ہیں۔

قال الجرز التی لا یمطر الا مطرا لا یغنی عنها شیئًا الا ما یاتیها من السیول۔[1]

جرز وہ ہے جہاں ناکافی بارش ہوتی ہو۔ سوا اس کے جو پانی سیلاب سے پہنچ جائے۔

حافظ سیوطی حسن المحاضرہ میں کہتے ہیں۔

"ایک جماعت کے نزدیک ارض جرز سے مراد مصر کی سرزمین ہے"[2]

حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔[3]

مفسرین عموماً ارض جرز کیلئے مثال میں مصر کا نام پیش کر دیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے مراد محض "مصر" ہے بلکہ ارض جرز میں سے مصر بھی ہے۔ مصر میں ارض جرز کا ہونا قطعی ہے وہاں کی زمین کی حالت یہ ہے کہ اگر بارش حسب ضرورت ہو تو مکانات منہدم ہو جائیں اسلئے اللہ تعالیٰ وہاں بارش کے بجائے اس پانی کو لے جاتے ہیں جو بلاد حبشہ میں برستا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۶۶ [2] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۴ [3] ج ۳ ص ۶۴ تفسیر ابن کثیر۔

اسی مفہوم کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے رسالہ عرشیہ[۱] اور منہاج السنہ[۲] میں بیان کیا ہے۔

منہاج السنہ میں ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں۔

فالارض الجرز لا تمطر ما یکفیها کارض مصر لو أمطرت مطر المعتاد لم یکفها فانها ارض ابلیز وان امطرت مطرا کثیرا مثل مطر شهر ازار " خربت المساکن فکان من حکمة الباری ورحمته ان امطرا رضا بعیدة ثم ساق ذلك ء الی ارض مصر فهذه الآیة یستدل بها علی علم الخالق وقدرته ومشیئة وحکمته۔	ارض جرز میں اتنا پانی نہیں برستا جو اس کے لئے کافی ہو جیسے مصر کی زمین کہ اگر معمولی بارش ہو تو وہ اس کو کافی نہیں، اس لئے کہ مصر کی زمین کیچڑ والی ہے اور اگر زیادہ پانی برسے مثلاً جتنی بارش کہ مارچ میں ہوتی ہے تو مکانات برباد جائیں۔ پس اللہ کی حکمت اور رحمت ہے کہ ایک دور مقام پر برساتا ہے پھر اس پانی کو مصر لے جاتا ہے۔ اس آب سے اللہ کے علم اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اسکی حکمت پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔

کس قدر دلچسپ بات ہے کہ جو چیز نولڈیکی کے نزدیک نعوذ باللہ صاحب قرآن کی بے خبری پر دلالت کرتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اسی سے خدا کے علم، اس کی قدرت مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال کرتے ہیں۔

یہ امر بھی خاص طور سے لائق توجہ ہے کہ یہ قحط مصر ہی میں نہ تھا بلکہ اس کے اثرات

---

[۱] ص ۱۳ [۲] ج ۳ ص ۱۱۔

دور دور تک تھے، برادران یوسف علیہ السلام کا غلہ کیلئے مصر آنا خود قرآن میں مذکور ہے۔ تورات میں بھی ان کا کنعان سے مصر تک غلہ کیلئے آنا مصرح موجود ہے[1]۔

"نہ صرف کنعان بلکہ اور بہت سے ملکوں کے لوگ غلہ کے لئے مصر آتے تھے"

(پیدائش باب۴۱)

عرب سے علاقہ یمن کے جنوب تک اسکے اثرات تاریخ سے ثابت ہیں چنانچہ ریورنڈ فارسٹر کے انگریزی "تاریخ جغرافیہ عرب[2]" میں ابن ہشام کے حوالہ سے درج ہے کہ ملک یمن میں سیلاب کے اثر سے ایک قبر کھل گئی جس میں ایک عورت کی لاش نظر آئی اس کے گلے میں موتیوں کے سات گلوبند ہاتھوں اور پیروں میں بازوبند اور سات سات چھڑے بھی تھے۔ ہر ہر انگلی میں نگینہ کی بیش قیمت انگوٹھی اور سرہانے زرومال سے لبریز ایک ایک صندوقچہ تھا۔ قبر میں ایک کتبہ بھی ملا۔ جس میں پہلے فقرے کے بعد پانچ اشعار درج ہیں۔ اس کی نقل حسب ذیل ہے۔

باسمك اللهم اله حمير	تیرے نام سے اے اللہ اے اللہ اے حمیر
(۱) انا ناحه بنت ذی شقر بعثت ما	میں تاجہ بنت ذی شقر ہوں میں نے اپنے شاہی
يرنا الی يوسف فابطأ علينا	داروغہ کو یوسف کے پاس بھیجا پھر جب واپسی
فبعث لاذتی،	میں دیر ہوئی تو میں نے اپنی خواص کو بھیجا۔
(۲) بمد من ورق لتاتینی بمد	چاندی کی ایک مقدار دیکر کہ اس کے عوض
من طحين فلم تجده فبعثت بمد	میں آٹے کی ایک مقدار لائے پھر جب وہ نہ مل

---

[1] پیدائش باب ۴۴ [2] ج ۲ ص ۱۰۳

من ذهب۔ | سکا تو پھر میں نے سونا دے کر بھیجا۔

(۳) فلم تجده فبعثت بمد من بحوری فلم تجده فامرت به فطحن۔ | جب اس سے بھی نہ مل سکا تو پھر میں نے موتی بھیجے اور جب اس سے بھی نہ مل سکا تو میں نے ان موتیوں کو پسوا ڈالا۔

(۴) فلم انتفع به فاقتفلت فمن سمع فلیرحسنی:۔ | وہ کسی کام نہ آسکے سو اب میں یہاں دفن ہوتی ہوں۔ جو کوئی میری خبر پائے اسے چاہئے کہ میرے اوپر ترس کھائے۔

(۵) وایه امرأة لبست حلیا من حلیتی فلا مانت الا میتتی۔ | اور اگر کوئی عورت میرے ان زیوروں پر طمع کرے اور انہیں پہننا چاہے تو اس کو میری ہی جیسی موت نصیب ہو۔

اس کتبہ سے معلوم ہوا کہ یمن تک اس قحط کے اثرات یقینی تھے تورات تو صراحۃً اس کی عالمگیری کی قائل ہے۔

(۵۳) اور سات برس ارزانی کے جو زمین مصر میں تھے، آخر ہوئے اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف نے کہا تھا آنے شروع ہوئے۔

(۵۴) اور سب زمین میں گرانی ہوئی۔ پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی۔

(۵۵) پر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کیلئے فرعون کے آگے چلائی۔ فرعون نے سب مصریوں سے کہا کہ یوسف کنے جاؤ وہ جو تمہیں کہے کرو۔

(۵۶) اور تمام روئے زمین پر کال تھا اور یوسف نے زمین کے کھتے کھول کے مصریوں کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین پر کال بہت بڑھا (۵۷) اور سارے ملک مصر میں یوسف کنے

مول لینے آئے کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔[۱]

ان حوالہ جات سے بیرون مصر قحط کے اثرات کا جب ثبوت موجود ہے تو مسئلہ اور واضح ہو جاتا ہے اسلئے کہ اگر مصر کو بارش سے محروم بھی تسلیم کرلیا جائے تو سارا عالم تو بارش سے محروم نہ تھا اور قرآن پاک میں "یغاث" کے ساتھ "الناس" کا لفظ بھی ہے۔ صرف اہل مصر کی تخصیص نہیں۔

(۷) اس موقع پر نفس آیت پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہیئے اور قرآن پر تنقید کے بجائے اس کے اعجاز و بلاغت اور اس کی صداقت کا اعتراف کرنا چاہیئے۔

توریت کی منقولہ بالا آیت سے معلوم ہو چکا ہے کہ جب سارے عالم میں لوگ بھوک سے پریشان تھے، اس وقت مصر میں خوشحالی تھی۔ آیت یہ ہے۔

"اور سب زمین میں گرانی ہو گی پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی ہو گی"۔

یہ خوشحالی درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب کے طفیل میں تھی جس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ (یوسف)

تم سات سال متواتر غلہ بونا پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں میں رہنے دینا مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی اس تنبیہہ کے باعث اہل مصر کو کسی قدر غلہ مل گیا تھا اور دوسرے ملکوں والے چونکہ بالکل بے خبر تھے اسلئے وہ کوئی انتظام نہ کر سکے۔ اب قابل غور امر یہ ہے کہ اس پوری آیت میں (یغاث) فریاد رسی ہو گی، یا بارش ہو گی) اور

---

[۱] پیدائش باب ۴۱۔

یعصرون (شیرہ نچوڑیں گے) کے سوا جتنے صیغے ہیں وہ سب حاضر کے ہیں (تزرعون) تم غلہ بونا۔ حَصَدْتُمْ۔ تم فصل کاٹو۔ تأکُلُوْنَ تم کھاؤ۔ (تحْصِنُون) تم جمع کروگے۔ گویا ان مخاطب صیغوں کا تعلق صرف اہل مصر سے ہے اور اسی لئے وہ نسبتاً نفع میں رہے اور ان کے بعد جو صیغے ہیں یعنی یغاث اور یعصرون وہ غائب کے صیغے ہیں۔

یہ التفات[1] بے سبب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش یا فریادرسی کا تعلق چونکہ دوسرے ملکوں سے بھی تھا اس لئے یہاں غائب کے صیغے استعمال کئے گئے تاکہ مفہوم میں عموم پیدا ہو اور نولدیکی جیسے محققین کو یہ شبہہ نہ پیدا ہو کہ مصر کی زمین تو بارانی نہیں ہے اسلئے وہاں بارش کیسے ہو سکتی ہے اور کاشت نیز غلہ کے جمع کرنے کا تعلق چونکہ صرف اہل مصر سے تھا اسی لئے وہاں خطاب کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب)

---

[1] التفات علم معانی و بیان کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم ہے کہ ایک ہی ضمن کی گفتگو میں صیغوں اور طرز خطاب کا تغیر و تبدل مثلاً ابھی گفتگو میں حاضر کے صیغے استعمال ہو رہے تھے یکایک غائب یا متکلم کے صیغے استعمال ہونے لگے۔ ابھی ماضی کا استعمال تھا کہ مضارع کا استعمال ہونے لگا و مثل ذٰلک۔ یہ علم بلاغت کا ایک اہم شعبہ ہے اور قرآن پاک کے التفات میں بے انتہا نکات ہیں جو علم بلاغت سے دلچسپی رکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہیں۔